اے حمید

برف باری کی رات

چنانچہ ایک روز ہم نے سامان باندھا اور مری کی طرف چل پڑے۔

ہم چار یار تھے۔ میں، احمی، خواجہ اور ماؤزے تنگ...... جس کا اصلی نام ملک غلام حسن تھا۔ لیکن چینی لیڈر سے غضبناک مشابہت کے باعث ہم سب یار اُسے ماؤ کہا کرتے تھے۔ گنجی چندیا کے اطراف میں کھڑے کھڑے برش نما بالوں کی سنجاف، گول مٹول چہرہ، پھیکے شلغم ایسی چھائیوں بھری کھال چھوٹی چھوٹی سُرخ آنکھیں جیسے گرم پانی میں ابالی گئی ہوں۔ جب وہ بدنما پیلے دانت نکال کر ہنستا تو آنکھیں اندر کو چھپ جاتیں اور مسوڑھوں کا لال لال گوشت صاف نظر آنے لگتا۔ ڈھیلے ڈھالے بدوضع کپڑوں میں ملبوس رہتا۔ چلتے وقت پاؤں اندر کو پڑتے، اور کندھے بھالو کی طرح دائیں بائیں ہلا کرتے۔ قمیض کے دو بٹن ہمیشہ کھلے رہتے جو سینے پر اُگے ہوئے گھنے سیاہ بالوں کے جنگل کو ہوا دیا کرتے۔ ناٹے قد اور مضحکہ خیز شکل وصورت والا ہمارا دوست ماؤ لاہور ریلوے ہیڈ کوارٹرز کے دفتر میں سینئر کلرک تھا۔ چار بچوں کا باپ تھا۔ عورتوں کے ذکر کے ساتھ ہی اس کی زبان سے چٹخارے کی سی آواز نکلتی اور آنکھوں میں پانی بھر آتا صنف لطیف کے ساتھ اس کے ایسے کرخت اور حیوانی لگاؤ سے مجھے بڑی کراہت ہوتی تھی۔ ایک بار میں نے اُسے کہا۔

تم عورت کے تقدس کو مجروح کر رہے ہو عورت ایک عظیم صنف ہے۔

اس پر ماؤ نے زور سے قہقہہ لگایا۔ میں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ جب ماؤ قہقہہ لگا کر ہنستا ہے تو اس کی آواز بالکل نہیں نکلتی۔ بس اس کا منہ کھلتا ہے۔ آنکھیں اندر کو گھستی ہیں

اور پھر صرف ایک بار 'کھی' کی آواز آتی ہے جیسے کوئی گیلا پٹاخہ چل جائے۔ میری بات پرا قسم کا ایک گیلا پٹاخہ چلا اور وہ گندے رومال سے آنکھیں پونچھتا ہوا بولا :۔

"میرے یار تم نہیں جانتے۔ دراصل تم لوگوں سے مجھے بھی یہی شکایت ہے کہ تم بھنے ہوئے گوشت کی پلیٹ کو ترکاری کھانے والوں کی نظر سے دیکھتے ہو"۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ماؤ میں کچھ اور باتیں بھی ہیں جو بڑی دلچسپ ہیں۔ وہ بڑی ترتیب اور اصول سے کھاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر وہ کراچی سے لاہور آ رہا ہو تو راستے میں گندا مندا کھانا بالکل نہیں کھائے گا۔ گھر وہ رات کو پہنچا ہے تو منہ ہاتھ دھو کر سب سے پہلے ناشتہ کرے گا۔ پھر دوپہر کا کھانا کھائے گا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ رات کا کھانا تناول کرے گا اور سب سے آخر میں دودھ پی کر سو جائے گا۔ موسمی پھل وہ ہر موسم میں صرف ایک دفعہ کھاتا ہے۔ امرود کی رت آئی ہے تو وہ امرود کے نمک مرچ لگے قتلوں سے بھری پوری پرات بیٹھ کر چٹ کر جائیگا اور پھر سارا موسم امرود کا نام نہیں لے گا۔ کبھی کبھی وہ شعر بھی کہتا ہے۔ مگر حافظہ کمزور ہونے کے باعث اکثر اپنے تخلص کی جگہ غالبؔ، میرؔ، موؔمن کا تخلص استعمال کر جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اچھی خاصی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ شعر بھی وہ عموماً بے وزن اور غلط سلط کہتا ہے۔ لیکن ایک شے جو قدرت نے اُسے دے رکھی ہے وہ ہے قصہ سنانے کا فن، داستان گوئی میں اس کا ہمسر پیدا نہیں ہو سکا۔ اُسے پوری الف لیلہ اور داستانِ امیر حمزہ ازبر ہے۔ یہاں اس کا حافظہ اس کی ہر قوت کو مات دے گیا ہے۔ جب وہ موج میں آ کر الف لیلہ کے کسی دل پھینک خوبصورت شہزادے کی داستان سنانے لگتا ہے تو محفل پر سناٹا چھا جاتا ہے، اور لوگ اپنا سانس روک لیتے ہیں۔ ماؤ کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ ایک ہاتھ فضا میں بلند ہو جاتا ہے۔ آواز کبھی نقرئی گھنٹوں کا روپ بدلتی ہے، کبھی شیر کی دھاڑ بن جاتی ہے، اور کبھی خشک پتوں پر ہوا کی سرسراہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ موٹی عورتوں کے عشق میں ناکام ہو کر صحراؤں کی خاک چھاننے والوں کے جذبات کی عکاسی وہ بڑی مہارت سے کرتا ہے۔ ان دل جلے عاشقوں کا حالِ زار وہ اپنا حال سمجھ کر بیان کرتا ہے۔ ویسے بھی اس کے قصے کی ہر عورت موٹی

ہوتی ہے، اور اگر دُبلی ہو تو ہمارا داستان گو دوست اسے قصہ سناتے سناتے کھلا پلا کر ہٹی کٹی بنا دیتا ہے۔ ماؤ کو ایک زمانے میں راگداری سے بھی دلچسپی رہی تھی۔ مگر بعد میں یہ دلچسپی عورتوں میں گڈمڈ ہو گئی۔ اب کبھی کبھی جب وہ اپنی بھدی آواز میں کوئی راگ الاپنے کی کوشش کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کوئی سانڈ پیٹ کے درد سے بلبلا رہا ہے۔ صوفی فوراً اس کی گنجی چندیا پر چپت لگا کر چیخ اٹھتا ہے۔

"بند کرو اس دُھر پد کو۔"

صوفی صاحب کا حال احوال مَیں آگے چل کر بیان کروں گا۔ کیونکہ اس وقت وہ مری میں ایک گھسا پٹا ہوٹل ٹھیکے پرلے کر چلا رہے ہیں جس کا نام انہوں نے سلورکنگ رکھا ہے ہم چاروں یار ہوٹل سلورکنگ میں بسیرا کرنے ہی جا رہے ہیں۔ صوفی صاحب کے متعلق میں صرف اتنا عرض کر دوں کہ آپ بے حد کنجوس آدمی واقع ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے کنجوس ہونے کا بے حد صدمہ ہے۔ چنانچہ وہ اکثر اپنے سر پر جوتے مارا کرتے ہیں اور خدا سے شکایت کیا کرتے ہیں کہ اُس نے انھیں کنجوس کیوں پیدا کیا۔

"بھائیو! میں اپنی فطرت نہیں بدل سکتا۔ اگر اگلے سال میں سخی دل نہ ہوا تو خود کشی کر لوں گا۔"

لیکن اس کا کیا کیجئے کہ اگلے سال وہ اور زیادہ کنجوس ہو جاتے ہیں۔ انھیں سگریٹ کی بالکل عادت نہیں ہے۔ مگر جب کسی دوست کی ڈبیا کھل جائے تو وہ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ سلگا کر پیتے ہیں۔ مشروب سے انھیں سخت نفرت ہے لیکن جب کوئی دوست لے آئے تو آؤٹ ہو کر جوتے سے اپنا سر کوٹنے اور اپنے آپ کو ملامت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کا چہرہ صفاچٹ ہے۔ کھچڑی بالوں والے چھوٹے سر پر وقت سے پہلے توڑے ہوئے ادھ پکے کدو کا گمان ہوتا ہے۔ جسم بوجھل اور توند پھولی ہوئی ہے۔ دوستوں کے پان کھا کھا کر دانت خراب ہو چکے ہیں۔ چہرے پر لجاجت اور عیارانہ تبسم ہر وقت عیاں رہتا ہے، دیکھنے میں بڑے بھولے بھالے بےضرر اور بدھو لگتے ہیں۔ حقیقت میں بڑے موقع پرست اور اپنی غرض کے دیوانے ہیں۔ نئے آدمی

سے متعارف ہوتے وقت لجلجا سا ہاتھ ملا کر بالکل موم سے ہو کر جھک جاتے ہیں
بے تکی ہانکنے اور ہر بات، ہر موضوع میں ٹانگ اڑانے کے عادی ہیں۔

لاہور میں بھی صوفی صاحب ایک ٹوٹا پھوٹا ہوٹل ہی چلاتے ہیں جو انہوں نے ٹھیکے پر لے رکھا ہے۔ ایک دن ہم سب دوست ان کے پاس کاؤنٹر پر بیٹھے تھے کہ ایک سفید برقعہ پوش عورت آئی اور اس نے صوفی سے آٹھ آنے مانگے صوفی نے کاؤنٹر کے تمام دراز کھول کر دکھائے اور بولے۔

"قسم لے لو جو ایک پائی بھی ہو۔"

جب عورت بے نیل و مرام واپس چلی گئی تو صوفی جیب سے اٹھنی نکال کر اس سے کھیلنے لگے۔ ہم نے پوچھا۔

"کون تھی یہ عورت؟"

مسکرا کر آہستہ سے بولے۔

"میری ماں تھی۔"

آپ کو جب علم ہوا کہ ہماری ٹولی کوہ مری آ رہی ہے اور قرعہ ہوٹل سلور کنگ کے نام نکلا ہے تو آپ نے فوراً ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعے ہماری آمد پر خوشی کا اظہار کیا، اور آخر میں صرف اتنا لکھ دیا کہ ہم سے کمروں کا کرایہ نصف لیا جائے گا ماؤ نے تمک ہرا کر کہا۔

"اس کمینے کی یہ مجال کہ ہم سے کرایہ لے۔ اس نے ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے۔ ہم اس کے ہوٹل میں آگ لگا دیں گے۔"

ہمارے [illegible] دوست خواجہ دلگیر صاحب نے بڑی متانت سے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں ایک ہی کمرے میں ڈیرا جمانا چاہیئے۔"

خواجہ دلگیر جسے ہم سب دوست صرف خواجہ ہی کہتے ہیں۔ بڑا سنجیدہ اور متین نوجوان ہے۔ شادی ابھی نہیں ہوئی لاہور میں کاپی پنسل سلیٹوں اور پرانی

کتابوں کی چھوٹی سی دکان ہے رنگ گہرا سانولا ہے۔ جسم پتلا ہے مگر قد کاٹھ کشمیریوں کی طرح چوڑا چکلا ہے۔ بھوؤں کے بال بڑے گنجان ہیں اور بچھو کے ڈنک کی طرح پیشانی پر اوپر کو اٹھے رہتے ہیں۔ دبلے پتلے جسم کی چٹک مٹک باگڑ بلّوں ایسی ہے۔ بہت کم بولتے ہیں۔ بہت زیادہ سگریٹ پیتے ہیں۔ شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے ان کی مثال بالکل اس مکڑے کی طرح ہے جس کی ساری محنت باریک ریشوں کا خطرناک جال بننے میں صرف ہوتی ہے۔ مکڑے کی طرح خواجہ دلگیر کے منہ سے، ہاتھوں سے جسم کی متین اور سنجیدہ حرکات سے غیر محسوس طور پر غیر مرئی باریک نظر نہ آنے والے ریشے ہر لمحہ نکلتے رہتے ہیں اور ایک خطرناک جال اپنے آپ بنتا چلا جاتا ہے۔ پھر جال بن کر تیار ہو جاتا ہے تو خواجہ ایک کونے میں اپنی لمبی لمبی نوکیلی ٹانگیں سمیٹے دبک کر بیٹھ جاتا ہے۔ جونہی کوئی شکار جال میں الجھتا ہے خواجہ لپک کر اس پر جھپٹتا ہے، اور آن کی آن میں اسے چٹ کر کے ہڈیوں کا ڈھیر نیچے پھینک دیتا ہے۔ خواجہ کی پھولی ہوئی ناک پر باریک کمانی کی عینک ہر دم چڑھی رہتی ہے۔ عینک ایک لمحہ اتر جائے تو آپ کو بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ سگریٹ خود بنا کر پیتا ہے، اور دوسروں کو بھی بنا کر دیتا ہے۔ عورتوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا دھیما، پر اسرار اور خطرناک ہوتا ہے۔ صنف نازک کے سامنے بیٹھ کر وہ بڑے اطمینان سے انگلیاں چٹخاتا ہے اور سگریٹ بنا بنا کر پیتا رہتا ہے۔ کچھوے کی طرح وہ بڑی موقع شناس کاہلی سے دھیرے دھیرے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، اور پھر اچانک حملہ کر دیتا ہے۔

ہمارا چوتھا یار احمی لاہور کے ایک مشہور نانبائی کا لڑکا تھا جس کی شہر کے صدر بازار میں بیکری کی دکان تھی۔ تین بار میٹرک میں فیل ہونے کے بعد جب اس کے باپ نے لاڈلے بیٹے کو بیکری کے دھندے میں لگا دیا، تو ڈبل روٹیاں کاٹتے کاٹتے نازک مزاج احمی کی انگلیاں دکھنے لگیں چنانچہ اس نے ایک سال تک تو چمڑے کے ایک مقامی تاجر کی دکان پر جز وقتی منشی گیری کا کام کیا، وہاں سے بھاگ کر فینائل اور تارپین بنانے والی ایک فیکٹری میں ٹائم کیپر ہوا۔ یہاں جی نہ لگا تو ایک ریٹائرڈ ہیڈ

کلرک کے بچوں کو اُردو اور حساب پڑھانے پر لگ گیا۔ پہلے ہی روز ہیڈ کلرک کی زرد رو نٹ کھٹ لڑکی سے آنکھ لڑ گئی۔ حساب کی کتابوں اور کاپیوں کے ذریعے رقعے بازی شروع ہو گئی، ایک روز دونوں عاشق و معشوق سیڑھیوں میں کھڑے مشغول تھے کہ ہیڈ کلرک نے دیکھ لیا۔ احمی نے ایک ہی جست میں چھ سیڑھیاں پار کر کے دروازہ کھولا اور باہر نکل بھاگا۔ اس کے بعد اس نے شہر کے اس علاقے کا کبھی رُخ نہ کیا۔ آج کل اس کا کام کبھی کبھی خالی وقت میں ٹائپ سیکھنا۔ باپ کی گدّی پر بیٹھ کر سگریٹ جائے کا خرچ اڑانا اور صبح و شام لڑکیوں کے کالج کے پاس بس سٹاپوں پر منڈلانا ہے۔
احمی کا رنگ گورا اور جسم دبلا تھا، ناک مڑی ہوئی تھی اور چہرے پر لنسواری رنگ کے بے شمار تِل تھے اُسے صرف کپڑے پہننے اور لڑکیوں کو عاشقانہ خطوط لکھنے کا شوق ہے۔ اس کے پاس کئی ایک لڑکیوں کے محبت بھرے خطوط تھے۔ جنہیں اس نے تصویروں کی طرح ایک سبز رنگ کی جلد والی البم میں لگا رکھا تھا۔ یہ البم وہ اپنے ہر دوست کو دکھانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کی کھنچی ہوئی آنکھوں کی پیلی رنگت بڑی خطرناک تھی۔ بظاہر اس کے چہرے میں کوئی کشش نہ تھی۔ لیکن آنکھوں کی اس پیلی رنگت میں بلا کا جادو تھا۔ ایک عجیب قسم کی بے بسی عاجزی، مکاری، اور کراہت کا ملا جلا احساس تھا۔ جو خواجہ دلگیر کے خیال میں عورتوں کے لئے اسم اعظم کا درجہ رکھتا ہے

کوہ مری کی سیر کا پروگرام اچانک بن گیا۔
صوفی کی بدقسمتی کہ اس نے مری میں جا کر ہوٹل سلور کنگ کا ٹھیکہ لے لیا اور پھر ہمیں کارڈ بھی ڈال دیا۔ دراصل خط اس نے اپنی برتری جتانے کے لئے لکھا تھا کہ اب وہ سارا سیزن مری کی ٹھنڈی ہواؤں میں رہے گا، اور ہمیں جو لاہور کی گرمی میں جھلس رہے ہوں گے۔ یاد کر کے خوش ہوا کرے گا۔ ماؤ نے خط پڑھنے کے بعد زور سے ناک صاف کر کے اعلان کر دیا کہ ہمیں اس حرامزادے کی خبر لینی چاہیئے۔ لہٰذا ہم سب کو مری کی طرف کوچ کر دینا چاہیئے۔ پروگرام تو بن گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ رقم کہاں سے پیدا کی جائے۔ ماؤ نے اپنے ریلوے کے دفتر سے پندرہ یوم کی رخصت لی اور ساتھ ہی اپنی بہن کی شادی کا بہانہ بنا کر دفتر کے امدادی فنڈ سے دو سو روپے قرض بھی لے لئے۔ خواجہ دلگیر نے رَف کاغذ کا ایک پرانا سٹاک ایک دوسرے دکاندار کے ہاتھ اونے پونے بیچ ڈالا۔ میں نے اپنے بڑے بھائی صاحب سے دو سو روپے ہتھیا لئے۔ احمی نے دکان سے کچھ روپے اڑائے اور ہم چاروں یار مری کی طرف چل پڑے۔

ماؤ کے پاس نصف ٹکٹ کا ریلوے پاس تھا۔ ہم رات کی گاڑی سے روانہ ہوئے۔ ماؤ نے پہلے ہی آ کر ڈبے میں اِدھر اُدھر چالاک بندر کی طرح پھلانگ کر ہم سبھوں کے بستر لگا دیئے اور دھوتی بنیان پہن لیٹ کر جاسوسی ناول کی ورق گردانی شروع کر دی۔ سارا راستہ بڑے مزے سے کٹا۔ جہلم سے پنڈی تک ماؤ نے اپنی بے ہنگم راگداری سے کسی مسافر کو سونے نہ دیا۔ پھر اس نے پہلی جنگِ عظیم کے ایک توپچی کی داستان شروع کر دی۔ جس پر ایک انگریز کمانڈر کی بیوی لٹو ہو گئی تھی۔ اور جو چوری چھپے اُسے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے کیک بھیجا کرتی تھی۔
خدا نے اس نیک دل بی بی کو بڑی موٹی موٹی آنکھیں عطا کی تھیں۔ دل پھینک توپچی کا بیان ہے کہ اس نے ایسی ماہ پارہ کبھی دیکھی نہ سنی۔
جتنی دیر ماؤ یہ داستان سناتا رہا خواجہ سامنے اپنے بستر پر بنیان اور انڈر ویئر پہنے بیٹھا انگلیاں چٹخاتا رہا۔ ماؤ نے جب ایک بار زبان سے چٹخارہ بھرا تو احمی کی نیند اُڑ گئی۔ وہ اپنی پیلی پیلی آنکھوں سے ماؤ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"کیا کھا رہے ہو؟"
گاڑی راولپنڈی پہنچی تو دن چڑھ آیا تھا۔ مری جانے والی بس صدر جا ملی۔ دھوپ بڑی تیز تھی اور گرمی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔ ماؤ پسینے میں شرابور تھا۔ کھلے گریبان میں سے سیاہ بالوں کا جنگل باہر کو آ رہا تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور بار بار منہ پونچھتے ہوئے گرمی کو کوس رہا تھا۔ خواجہ جیب سے زمبک مرہم کی خالی ڈبی نکال کر سگریٹ بنانے لگا۔ تو ماؤ نے پھنکارنے انداز میں ہاتھ جھٹک

کر کہا۔

"ارے لعنت ہے تم پر ۔۔ اتنی گرمی میں بھی باز نہیں آتے سگریٹ پینے سے۔"

خواجہ خاموشی سے ہنستا رہا۔ اجمی نے گردن پر رومال پھیرتے ہوئے کہا۔

"لا یار خواجہ ایک میرے لئے بھی۔"

ماؤ نے پتلون کے اندر سے قمیض باہر کھینچتے ہوئے کہا۔

"پہاڑ کے خیال سے زیادہ گرمی لگ رہی ہے کوئی نہیں۔ ابھی کوئی دم میں ٹھنڈی ہوائیں بوس و کنار کر رہی ہوں گی۔"

۲

سلور لنگ ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے کنجوس صوفی نے ہماری ٹولی کو سامان مزدوروں کے سروں پر رکھوائے افتاں و خیزاں سڑک کی چڑھائی چڑھتے دور ہی سے دیکھا اور اس کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اندر گیا، میلی کچیلی وردی پوش نوکروں کے پاس جا کر پھولی ہوئی توند پر ہاتھ مار کر بولا:

"کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔ وہ میرا مال کھانے والے میرے سوتیلے آ گئے ہیں"

اس کے بعد اس نے پاگل ریچھ کی طرح خرخراتے ہوئے کمرے کے دو تین چکر کاٹے اور باہر کاؤنٹر پر آ گیا۔ ہماری ٹولی اس وقت ہوٹل کے باہر پہنچ چکی تھی، اور مزدور سامان رکھ رہے تھے۔ ماؤ نے جواب خاکی رنگ کا گرم مفلر اوڑھے تھا دونوں ہتھیلیاں ملتے ہوئے کہا۔

"ارے یہاں کیوں رکھ رہے ہو اوپر لے جاؤ ۔۔۔۔۔۔۔ کیوں بھئی صوفی کون سا کمرہ ہے؟"

صوفی بتیسی کھول کر بڑے عیارانہ مخصوص تبسم کے ساتھ ہم سب کو ملا

"واہ واہ! خوب رونق رہے گی۔"

خواجہ نے کہا۔

"خوب مزا رہے گا پیارے۔ تمہارا مال کھائیں گے اور اپنوں کی روح کو

ثواب پہنچائیں گے۔"

صوفی اب کچھ نہیں کرسکتا تھا نادر شاہ کی فوجیں رنگیلے کے محل میں داخل ہو چکی تھیں۔ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

"کھاؤ پیارو کھاؤ ——— دوستوں سے بڑھ کر کوئی شے پیاری نہیں۔"

احمی نے ماؤ کو کہنی ماری۔

"یہ تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ تم کمروں کے نمبر بتاؤ۔"

"میں نے تمہاری سہولت کے لیے ایک پورا ہال کمرہ ریزرو کر دیا ہے۔ اس کمرے میں آگ جلانے کی انگیٹھی بھی ہے۔"

صوفی جسے ہال کمرہ کہہ رہا تھا، وہ ہوٹل سلور کنگ کی دوسری منزل پر ایک سٹور روم تھا، جو کاٹھ کباڑ سے بھرا پڑا تھا، اور سیلن اور جلی ہوئی لکڑی کی ملی جلی بُو اٹھ رہی تھی ماؤ صوفی کو گالیاں دینے لگا۔

حرامزادے! ہم کوئی مفت خورے ہیں، جو اس چڑیا گھر میں رہیں۔ کمینے! ہم تجھے کرایہ دیں گے۔"

صوفی ہنسنے اور توند پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"ارے یارو گرم کیوں ہوتے ہو۔ ایسا اول نمبر کمرہ سارے ہوٹل میں نہیں میں اسے ابھی صاف کروائے دیتا ہوں۔ ارے رمجو..... ادھر آبے....!

صفائی کے بعد کمرے کی بدہیئتی اور بے ڈھنگا پن اور زیادہ نمایاں ہو گیا اس کی دیواریں کلر زدہ تھیں چھت سے جالے لٹک رہے تھے۔ کونے میں کو جھینگر بولتے اور دن کو چھپکلیاں رینگا کرتیں۔ آتشدان کی اینٹیں ڈھے چکی تھیں اور دیوار دھوئیں سے کالی سیاہ ہو کر باہر کی روشنی میں لشک رہی تھی۔ جب کمرے کا کوڑا کرکٹ ہٹایا گیا تو نیچے سے ایک جھلنگا پلنگ نمودار ہوا۔ جس کی چولیں ہاتھ لگانے سے ہی بول اٹھتیں۔ ہم چاروں میں اس بات پر جھگڑا شروع ہو گیا کہ پلنگ پر بستر کون جمائے؟ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ پلنگ آخر پلنگ تھا اور زمین سے تو ہٹ

رہے بستر تھا۔ آخر طے ہوا کہ ہر آدمی ایک رات اس پر سویا کرے پہلی رات ماؤ نے انتخاب کر لی۔ اس نے بڑے ٹھسے سے اس پر اپنا بستر جما دیا۔ اٹیچی کیس میں سے شیو کا سامان ٹوٹا ہوا گول آئینہ، کنگھی، کریم کی شیشی، تیل اور جاسوسی ناولوں کا پلندہ نکال کر اسے گرد آلود کارنس پر رکھ دیا۔ ہم لوگوں نے بھی مجبوراً اپنے بستر سیلے فرش پر بچھا دیئے۔ اب ہر شخص بڑے زور شور سے داڑھی بنانے لگا۔ میں باہر بالکونی میں آ گیا۔ بالکونی کیا تھی دیمک زدہ پرانی لکڑی کی ایک مچان تھی جس کے آگے بانس کی باڑھ لگا دی گئی تھی۔ سامنے جھونپڑی نما مکانوں کا سلسلہ تھا جن کی جھکی ہوئی دیواروں کی کھڑکیاں ہماری طرف کھلتی تھیں۔ نیچے گلی تھی جس میں سارے ہوٹل کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ اور جس میں سے طرح طرح کی بدبو اٹھ رہی تھی۔ کہیں سے پانی کے مسلسل گندی نالی میں ٹپکنے کی صدا آ رہی تھی مری کا آسمان ابر آلود تھا، اور ٹھنڈی بلکہ کپکپی طاری کرنے والی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ چونکہ ہم ابھی ابھی لاہور کی سخت گرمی سے نجات حاصل کر کے اس بہشت میں داخل ہوئے تھے۔ اس لیے سردی کا خیال کیے بغیر بڑے مزے سے صرف بنیان میں ہی ادھر ادھر چکر لگا رہے تھے۔ میں نے آئینہ بالکونی کے بانس میں اڑایا، اور صابن لگا کر شیو بنانے لگا۔ کمبخت صوفی نے ہمیں شیو کے لیے انتہائی یخ پانی بھجوایا تھا۔ جس نے بالوں کو نرم کرنے کی بجائے انہیں مزید سخت بنا دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب ہم سب شیو سے فارغ ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے گالوں کی کھال اتر گئی ہے مگر بال ایک بھی نہیں اترا۔ چڑ کٹے ماؤ کا تو برا حال ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ سے چہرہ چھل گیا تھا۔ جہاں اس نے پاؤڈر تھوپ رکھا تھا۔ سوٹ کیسوں میں سے ہم نے بڑی محنت سے استری کر کے تہہ کی ہوئی پتلونیں قمیضیں، مفلر اور سویٹر نکالے۔ ان میں سے فنیائل کی گولیوں کی بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ انہیں ہینگروں میں ڈال کر دروازوں کی چٹخنیوں سے لٹکایا کیونکہ دیواریں شور زدہ تھیں اور کپڑوں کی الماری کا ہوٹل سلور کنگ میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا) نہانے کے لیے باری باری

نیچے ایک ایسے غسل خانے میں جانا پڑا جس کے فرش پر پھسلن کی وجہ سے کھڑا ہونا کسی مرد مجاہد کا ہی کام تھا۔ اس پر ستم یہ کہ اس کا بغیر چٹخنی کے دروازہ بار بار کھٹک سے کھل جاتا۔ معلوم ہوتا کہ بیرا تسلہ ہاتھ میں لیے پانی لینے آیا ہے۔ بیرا اس قسم کے مناظر کا عادی تھا۔ وہ ہماری طرف آنکھ اٹھائے بغیر بڑے اطمینان سے نل کے نیچے تسلہ رکھ کر اُسے بھرتا اور باہر نکل جاتا۔ نہانے کے بعد سردی میں سب کے دانت بجنے لگے۔ فوراً گرم چائے منگوا کر پی گئی۔ جس میں، سے ایک ایسی لکڑی کی بو آرہی تھی، جو وارنش کے پیپے میں پڑی پڑی سڑ گئی ہو۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر کپڑے پہنے گئے۔ پتلونوں سویٹروں اور ٹائیوں کا تبادلہ ہوا۔ میری ٹائی احمی کو پسند آگئی۔ احمی کا پھولدار سویٹر خواجہ نے پہن لیا اور اپنی چمڑے کی جیکٹ اُسے دے دی، ماؤ نے اپنا ہزار سالہ پرانا شادی والا گیبرڈین کا سوٹ زیبِ تن کیا جس کی میل استری کی وجہ سے جگہ جگہ چمک رہی تھی۔ اس نے ایک سویٹر بنیان کے اندر اور دوسرا قمیض کے اوپر پہنا، اور خاکی اونی مفلر گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ جب ہم چھیلے بنے، لپ جھپ کرتے شہزادوں کی طرح مری کی مال روڈ پر نکلے تو کسی کو دیکھ کر خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ ہم ہوٹل سلور کنگ کے کباڑ خانے میں رہتے ہیں، اور ہم نے اپنے بستر سیلے فرش پر لگا رکھے ہیں۔

مال پر بڑی چہل پہل تھی۔ سیزن اپنے جوبن پر تھا۔ عورتیں ریشمی ساریوں، غراروں اور شلوار قمیضوں میں ملبوس، بھرپور میک اپ کئے اِدھر اُدھر چل پھر رہی تھیں کالج کی بال کٹی شوخ و شنگ لڑکیاں ٹولیوں کی صورت میں ہنستی قہقہے لگاتیں خوشبو اڑاتی سنہری بدلیوں کی طرح گذر رہی تھیں، پھیکے پژمردہ چہروں والے بیوپاری بکڑیوں کی مدد سے ہانپ ہانپ کر مال روڈ کی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ ہوٹلوں میں بڑی گہما گہمی تھی۔ شام ہونے کو تھی۔ موسم بے حد خوشگوار تھا آسمان بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ سرمئی بادلوں کا کوئی زندہ دل آوارہ ٹکڑا اِدھر اُدھر چڑھ کے درختوں میں سے ہوتا ہوا چپکے سے مال پر اتر آتا اور یہاں وہاں خوبصورت آنکھوں والی خوشبودار لڑکیوں کے گال سہلاتا، وادی کی طرف نکل جاتا۔ مال روڈ پر کچھ دیر

لیے دھند چھا جاتی، اور کانوں میں جھولتے احمریں آویزے نظروں کے سامنے
ے اوجھل ہو جاتے۔ پھر جب عاشق مزاج بادل کا شہزادہ خوشبوؤں اور خوبصورت
یکا خزانہ سمیٹے مال پر سے پھسل کر وادی میں اتر جاتا تو لوگوں کے چہروں اور کپڑوں
ں کی ہلکی سی تہہ جمی ہوتی عورتیں جلدی جلدی دکانوں میں داخل ہو کر چہروں پر پف
نیں۔ لمبی لمبی گھٹنوں پر تنگ ہوتی قمیضوں والی کشیدہ قامت لڑکیاں ہنس
س کر ایک دوسری سے باتیں کرنے لگتیں۔ یوں معلوم ہوتا گویا گھرے دبیز ابر کے
ٹ جانے سے ایک دم سورج نکل آیا ہو، اور اس کی سنہری کرنوں سے وادی
بشن ہو گئی ہو۔

"مال پر نظارہ بازی کیلئے سیمز ہوٹل سے بڑھ کر کوئی اچھی جگہ نہیں ہے دوستو!"
یہ خیال زندہ دل ماؤ کا تھا۔ چنانچہ ہماری ٹولی نے سیمز کے جہازی ہوٹل
پہنچ کر ایک بڑا سا موزوں کونہ قبضے میں کر لیا ہوٹل میں اس وقت بڑی رونق
۔ کوئی ٹیبل خالی نہ تھی۔ کونے میں بیٹھتے ہی ماؤ کی آنکھوں نے بڑی چابکدستی سے
دم بھر کر ماحول کا پورا جائزہ لیا، اور آخر ایک جگہ مرکوز ہو گئیں۔ یہاں تیس پینتیس
س کی ایک ہٹی کٹی لال گلال پھولے پھولے گالوں والی عورت بیٹھی ایک گنجے
ی سے باتیں کر رہی تھی۔ عورت کے بال برجی باردوت کے انداز میں ماتھے
پڑے ہوئے تھے۔ جسم کے ساتھ بالکل فِٹ ریشمی قمیض اس کے جسم کے
ام بھدے اور بھاری بھر کم خطوط نمایاں کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا، کہ ہمارا
وست ماؤ اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے..... چہرے کا رنگ فق
ہے۔ اور آنکھوں میں بار بار پانی آجاتا ہے۔ خواجہ دگیر نے اپنی انگلیاں ماؤ کی
بلی میں گھسیڑ دیں۔

"کمینے! کیوں اپنا خانہ خراب کر رہا ہے۔"

ماؤ کھی کھی کرکے گردن ایک طرف لٹکا کر ہنسنے لگا۔ ہم گرم گرم کافی پی رہے
تھے، اور باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ مال پر اڑتی پھرتی تتلیوں کے قدم

تیز ہو گئے ۔ اب لڑکیوں کی جوٹولیاں آ رہی تھیں ۔ انہوں نے نیلی پیلی ، زرد ا
پنک رنگ کی نائلون کی برساتیاں پہن رکھی تھیں ۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رنگا
برنگ پھولوں کے گلدستے سیر کیلئے مال روڈ پر نکل آئے ہوں ۔

"یارو ! اس حسینہ گلعذار کا اتا پتہ معلوم کرنا چاہیئے ۔"

ماؤ نے بڑی تشویش سے سر ہلا کر کہا ۔ خواجہ نیا سگریٹ سلگا کر بولا ۔

"ارے گلفام کے پتّر ! کبھی تو نے آئینے میں اپنی شکل بھی دیکھی ہے کیا ؟"

"شکل دنیا میں کوئی شئے نہیں خواجہ ۔ میں نے کہا آسکر وائلڈ کا وہ جملہ تو تم
سنا ہی ہوگا کہ عورت کانوں کے بھروسے محبت کرتی ہے ، اب ایک قول میرا
سن لو ۔ حسین سے حسین عورت ایک گونگے کے قدموں پر جھک سکتی ہے بشرطیکہ
دولت مند ہو ، تم اسے ایک فرسودہ خیال کہو گے ، لیکن میں کہتا ہوں یہ ایک بہ
بڑی حقیقت ہے ۔ عورت صرف زبان اور دولت سے عشق کرتی ہے ۔"

احمی نے دیا سلائی کان میں گھماتے ہوئے کہا :۔

"اس عورت کے متعلق کیا خیال ہے جناب کا ؟"

ہم سب نے نیچے دیکھا ۔ مال پر ایک موٹی بھدّی بے حد بدشکل عور
بے اندازہ میک اپ تھوپے قدم قدم پر شرماتی بل کھاتی چلی جا رہی تھی ۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا ۔ اس کے قہقہے کی آواز ہمارے سوا ہوٹل میں اور کسی
نہ سنی ۔ ماؤ بڑے موڈ میں آ رہا تھا ، اور بڑی گرم گرم متلاشی نگاہوں سے برجی بار
کے بالوں ایسی موٹی عورت کو دیکھ رہا تھا ۔ جب تیسری بار ماؤ نے کافی کا آرڈر
تو خواجہ نے کافی کے بجٹ کے پیسے نکال کر میز پر رکھ دیئے ۔ ماؤ دانت نکا
کر بولا :۔

"فکر نہ کرو —— اس آفتِ روزگار کے نام پر ایک کافی میری ط
سے —"

رات کو جب ہم مال کی سیر کے بعد قسم قسم کی خوبصورت لڑکیوں کے تصو

لئے ہوٹل سلور کنگ کے کباڑ خانے میں آئے تو وہاں ایک پل کھڑے ہونے کو جی
نہ چاہا ۔ ماؤ نے اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی مریل سی کالی بلی کو جوتا مارتے ہوئے موٹی
سی گالی دی اور کہا :۔

"لعنت ہے ہماری زندگی پر —— آج کی رات تو اس ملکۂ ناز کے قدموں
میں بسر ہونی چاہیئے تھی ۔"

باہر بوندا باندی نے اب ہلکی ہلکی بارش کی صورت اختیار کر لی تھی ۔ ہم نے کھانا
منگوایا تو کنجوس دل صوفی بھی ساتھ ہی آ گیا ۔

"میں نے سوچا ، اپنے یاروں کے ساتھ ہی مل کر کھانا کھا لوں ۔ زندگی کا کیا
بھروسہ ہے ۔"

ہمارے ساتھ کھانے پر وہ بھوکے سانڈ کی طرح جٹ گیا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ
وہ جب سے مری میں آیا ہے اُسے آج ہی کھانا نصیب ہوا ہے ۔ ماؤ نے صوفی
کے ہاتھ پر چمچ مار کر کہا ۔

"کمینے ہوش کے ناخن لے ...... بوٹی پر بوٹی کھائے جا رہا ہے ۔"

صوفی بڑی لجاجت سے بولا :۔

"میری جان ! میں کیا کروں ۔ یہاں تو بوٹی بوٹی پر میرے نام کی مُہر لگی ہے"

پھر وہ جھلنگا پلنگ کی طرف دیکھ کر بولا :۔

"ارے واہ ! یہ پلنگ یہیں پڑا تھا ؟ میں نے خواہ مخواہ تمہارے لئے باہر
سے چارپائی منگوائی ۔ چلو تم بھی کیا یاد کرو گے پلنگ پر سو کر عیش کرو ۔"

کھانا کھا کر صوفی نے ایک زبردست ڈکار لی ، اور توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا

"یار چائے کا آرڈر نہیں دو گے ؟"

خواجہ دستگیر زمبک کی خالی ڈبی میں سے تمباکو نکال کر باریک کاغذ پر رکھتے
ہوئے چیخا :۔

"او کمینے یہاں سے دفع ہو جا ۔"

"شرم کرو خواجہ ـــــ خدا کی قسم کبھی ہماری دوستی کو یاد کرو گے۔ سگریٹ پلاؤ۔"

خواجہ کا پہلا سگریٹ صوفی نے سلگا کر ایک لمبا کش لیا، اور کھانستے ہوئے باہر نکل گیا۔ رات کو کمرہ یخ ہو گیا۔ سیلی دیواریں ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنے لگیں بند کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں میں سے سرد ہوا کے فراٹے چلے آرہے اس پر طرہ یہ کہ دو ایک جگہوں سے چھت بھی ٹپکنے لگی بارش تھی کہ تھمنے کا نام ہی لیتی تھی۔ ہم سب اپنے اپنے لحافوں میں گھس گئے۔ ماؤ کو پلنگ پر لیٹتے ہی معلوم ہو گیا کہ اس نے پلنگ کا انتخاب کر کے بہت بھاری غلطی کی ہے۔ کیونکہ پلنگ کھٹملوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے بار بار پہلو بدلنے سے پلنگ بڑے ڈراؤنے ہیں چرچرانے لگا۔ آخر ماؤ اپنے لحاف سے باہر کود آیا۔ اس نے بتی جلائی۔ احمی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟"

"کھٹمل۔" ماؤ نے چھاتی پر رینگتے ہوئے ایک کھٹمل پر زور سے ہاتھ مارا ہم سب ہنس پڑے۔

"اور سوؤ بیٹا پلنگ پر۔"

ماؤ نے کپڑے پہن کر کمبل سے منہ سر لپیٹا اور میرے بستر میں آکر بیٹھ گیا۔ بارش نے مری کی وادی اور اونچی نیچی سڑکوں کے خوب صورت بنگلوں، کاٹجوں غریب واڑوں کے جھونپڑوں کو دھند کی گہری چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔

ماؤ سردی میں ٹھٹھر رہا تھا، کہنے لگا۔

"یارو آگ جلائی جائے۔"

اس نے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں کوئی شے جلانے والی نہ تھی۔ [illegible] نے دروازہ کھول کر بالکونی کے فرش کی دو تین کھپچیاں اکھاڑیں، اور انہیں آتشدان جوڑ کر آگ سلگائی۔ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ ہر کوئی کھانستا ہوا ماؤ کو گالیاں د

لگا۔ مگر جب سرخ سرخ گرم گرم آگ روشن ہو گئی تو سب آتشدان کے قریب آکر بستروں پر لحاف اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ چائے کی کیتلی آگ پر رکھ دی گئی۔ تھوڑی دیر بعد چائے کا دور چلنے لگا۔ ماؤ نے چٹخارہ بھر کر کہا۔

"جاؤ ابھالو نتھیا گلی میں ہے۔ سالا یہاں ہوتا تو چائے کی جگہ مشروب احمریں کا دور چل رہا ہوتا۔"

احمی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ خواجہ نے سگریٹ بنا کر احمی کو دیا۔ دوسرا خود سلگا کر بولا

"میں نے اسے خط لکھ دیا ہے۔ امید ہے کل تک آجائے گا۔"

"بس پھر مزا آجائے گا۔" ماؤ بولا۔

خواجہ اپنی باریک کمانی دار عینک کے شیشے منہ کی بھاپ دے کر صاف کرتے ہوئے بولا۔

"پورا راجہ اندر ہے راجہ اندر۔"

ماؤ نے چائے کی تیسری پیالی غٹاغٹ چڑھا کر ڈکار مار کر کہا۔

"بس پھر کل اس کباڑخانے میں راجہ اندر کا دربار لگے گا۔"

"اور آج؟" احمی نے پیلی آنکھیں جھپکا کر پوچھا۔

ماؤ ہنس پڑا۔ آگ کی روشنی میں اس کی گنجی کھوپڑی چمک رہی تھی۔ ٹیڑھے میڑھے دانت نکالے وہ کوئی بھوت معلوم ہو رہا تھا۔

"آج راجہ اندر کی داستان ہو گی ـــ کہانی لکھنے والا اس داستان کو پراچین بھارت کے ایسے دور سے شروع کرتا ہے۔ جب آکاش کی اپسرائیں دھرتی کے باسیوں کے ساتھ شادیاں کیا کرتی تھیں۔ کہتے ہیں اسی زمانے میں ......"

اس کے بعد ماؤ نے اپنے مخصوص دل نشیں اور شیریں انداز میں تشبیہوں اور استعاروں کے سنگار سے آراستہ پیراستہ ایک ایسی دل ربا داستان کا آغاز کیا جس نے ہم سبھوں کی نیند اڑا دی۔

۳

ہمارے ساتھ ہی بازو والے کمرے میں ایک دقیانوسی انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کی رہائش تھی۔ تنگ پیشانی، عورتوں ایسے بال، پتھر ایسا سر دبے جان چہرہ، چیچک کے داغ، گدھ ایسی نوکیلی ناک ـــ چالیس پنتالیس کی عمر۔ ہر وقت سجا بنا رہنا۔ ساری عمر بھارت کے بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی مصاحبت میں گزری تھی جس کی وجہ سے گفتگو کا انداز خوشامدی اور پھڑ بازی کی حد تک مبالغہ آمیز ہو گیا تھا۔ صبح صبح سج بن کر چمڑے کا تھیلا ہاتھ میں لے اس کاٹھ گدام سے باہر نکلتا اور دوپہر کے کھانے پر واپس آجاتا۔ نیز طبیعت میں مانگے کا امیرانہ ٹھاٹھ جڑ پکڑ چکا تھا۔ چنانچہ خواہ مخواہ ہوٹل کے بیروں پر برستے رہنا، اور صوفی کے سامنے بڑے بڑے ہوٹلوں کے حوالے دیتے رہنا اس کا معمول ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی شام کو اسے ملنے ایک عیسائی عورت آیا کرتی تھی۔ وہ لپ جھپ کرتی لہنگا سنبھالتی سلورکنگ ہوٹل کی لکڑی کی چرچوں کرتی سیڑھیاں طے کر کے ایجنٹ کے کمرے میں داخل ہو جاتی جو اس کے انتظار میں نیم وا ہوتا۔ دروازہ اس کے اندر داخل ہوتے ہی بند ہو جاتا۔ ہم نے ماؤ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے۔ دیوار میں ایک جگہ جہاں لکڑی کے تختے لگے تھے سوراخ کر رکھا تھا۔ ادھر وہ محبت کی ماری ایجنٹ کے کمرے میں گھستی ادھر ہم چاروں سوراخ کی طرف اٹھ دوڑتے۔ ایک روز سگار جلانے کے لئے ماچس کی تلاش میں یہ ایجنٹ ہمارے کباڑ خانے میں نکل آیا۔ ہماری اس سے دوستی ہو گئی

اس نے ایک سگار ماؤ کو دیا، اور بولا۔

"یہ اسی کمپنی کا سگار ہے جو چرچل کے لئے سگار تیار کرتی ہے۔ مہاراجہ جودھپور کے پاس پہلی بار میں نے یہ سگار پیا تھا۔ اس کے بعد تو میں نے اس کے علاوہ کبھی کچھ پیا ہی نہیں۔ ڈائریکٹ انگلینڈ سے منگواتا ہوں۔ ڈیوٹی وغیرہ نکال کر ایک روپے کا سگار پڑتا ہے۔"

ماؤ کو بے اختیار کھانسی آگئی۔

"بڑا کڑوا ہے یہ!"

"اجی مدراس میں اس سے بھی کڑوے پئے ہیں میں نے۔"

اس کے بعد ایجنٹ کی ہم سے دوستی ہو گئی۔ وہ اکثر ہمارے پاس آنے لگا لیکن ہمیشہ بیئر اپنے کمرے سے ہی پی کر آتا اور سگار بھی صرف ایک ہی لے کر آتا جو اس کے منہ میں سلگ رہا ہوتا۔ ایک روز لڑکیوں کی بات چل نکلی تو کہنے لگا۔

"وائی بیجاپور میرا بڑا فاسٹ فرینڈ تھا۔ سارا محل میرے ڈسپوزل پر تھا۔ دربار میں ایک لڑکی مجھ پر عاشق ہو گئی۔ دنیا کی حسین ترین لڑکی تھی۔ میرے ساتھ لاکھوں کے ہیرے موتی لے کر فرار ہونے پر تیار ہو گئی۔ لیکن بھائی میں نے ارادہ بدل دیا۔ بڑی کمپلی کیشنز پیدا ہو جانے کا ڈر تھا۔"

صوفی نے ہوٹل کے احاطے میں سیب کا پودا لگایا۔ وہ کمبخت بڑا ہی ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ایجنٹ نے اس کی ٹہنی پر نبض دیکھنے کے انداز میں ہاتھ رکھ کہا۔

"عنبری سیب نہیں ہے۔ پیوندی ہے، اور پھر مر چکا ہے۔ ہاں یاد آیا۔ میرے ایبٹ آباد والے گھر میں عنبری سیب کا درخت ہے۔ شہنشاہ جاپان کے خاص محل کا تحفہ ہے مجھے میرے ایک دوست افسر زراعت نے دیا تھا۔ عنبری سیب کے علاوہ میں نے کبھی کوئی اور سیب نہیں کھایا۔"

ایک دفعہ ایجنٹ صاحب بیمار پڑ گئے۔ میں مزاج پرسی کو گیا بستر میں دھنسے تھے۔ گرم پانی کی تین بوتلیں لحاف کے اندر دبوچ رکھی تھیں۔ میں نے پوچھا:

"تکلیف تو بہت ہوتی ہوگی۔"

سر جھٹک کر بولا۔

"مجھے کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔ ایک بار ہوئی تھی تو ملٹری کے پندرہ ڈاکٹر لئے تھے، اور ان میں سے کوئی بھی کرنل کے رینک سے نیچے نہ تھا۔ ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھ گیا تھا۔

ویسے یہ آدمی بڑا ہوشیار تھا۔ اس میں اصل بات کو بڑی چالاکی سے ٹال کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ ماؤ نے کئی بار اس سے پوچھنا چاہا کہ وہ عیسائی حسـ کون ہے جو اُسے کبھی کبھی شام کو ملنے آیا کرتی ہے؟ لیکن ایجنٹ ہر بار بات کا دوسری طرف پھیر دیتا، اور اتنی خوب صورتی سے کہ ہم سب اس کا منہ دیکھتے رہ جا ہم سب نے دِل میں ٹھان رکھی تھی کہ اس پُرکار ایجنٹ کے پیچھے جاوا بھالو کو چھ گے وہ اسے چاروں شانے چت گرا دے گا۔

جاوا بھالو پانچویں روز نتھیا گلی سے مری آیا۔ بھالوؤں ایسا ڈیل ڈول، با کے نیچے سیاہ مسّا، تنی ہوئی بھنوئیں۔ ناٹے قد کا چوڑا چکلا ہمارا پانچواں یار جاوا رنگ کی فوجی برانڈی میں ملبوس ہوٹل میں داخل ہوتے ہی صوفی سے بغلگیر ہو گیا بھرپور شکنجے میں لے کر اس نے صوفی کی ہڈیاں کڑکڑا دیں۔

جاوے نے بھی پروگرام کے مطابق اپنا بستر ہمارے ہی کمرے میں یا نکئے لیا۔ اس نے اعلان کر دیا:-

"دوستو! اس مکھی چوس صوفی کے ہوٹل کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ اس سب کچھ کھا پی کر اسے خاک سیاہ کر دو۔"

۴

اگلے روز شام کو سیمنز ہوٹل کا پھر پروگرام بنا۔

چار بجے سے ہی ہمارے کباڑ جانے میں ہر آدمی تولیہ لیئے اِدھر اُدھر منڈلاتا، کپڑوں کو اُلٹتا پلٹتا، دن کے دن ادھار مانگی ہوئی پتلونوں، ٹائیوں اور قمیصوں کو استری کرتا اور رگڑ رگڑ کر شیو بناتا نظر آ رہا تھا۔ چھ بجے بنے ٹھنے بانکوں کا قافلہ سیمنز کی گیلری میں آ کر بیٹھ گیا۔ کافی منگوا کر ہم نے نظر بازی شروع کر دی۔ مال پر رنگ برنگ ساڑھیوں غراروں اور شلواروں کی ٹولیوں کی ٹولیاں گذر رہی تھیں۔ کوئی عورت ہماری نگاہوں سے بچ کر نہ گزرتی تھی۔ ہوٹل میں بھی اچھی خاصی عورتیں بیٹھی کافی پی رہی تھیں۔ خواجہ کافی کی پیالی سامنے رکھے، ہاتھ سے بنایا ہوا سگریٹ منہ میں لئے بیٹھا تھا، اور باری باری ہر عورت کو گھورتے ہوئے انگلیاں چٹخا رہا تھا۔ ماؤ بسنتی سوئٹر پر جاوے بھالو کی سرخ ٹائی لگائے چھیلا بنا بیٹھا تھا اور بات بات پر ہنس رہا تھا۔ احمی سر درد کا بہانہ بنا کر ہوٹل میں ہی رہ گیا تھا اور ہمارا خیال اب یقین میں بدل گیا تھا۔ کہ وہ ہوٹل کے پچھواڑے ایک لونڈیا سے عشق لڑا رہا ہے۔ پیلے رنگ کی یہ دبلی سی لڑکی جس کے گال پر سبز خال کا نشان تھا۔ بڑی تیز اور چمکیلی تھی سارا دن اپنے لکڑی کے پرانے چوبارہ کی کھڑکی میں کھڑی ہم سے آنکھیں لڑایا کرتی۔ احمی اس پر جی جان سے فدا ہو گیا تھا، اور اس نے لونڈیا سے باقاعدہ اشارہ بازی بھی شروع کر دی تھی۔ لونڈیا بھی ایک ہی آفت کی پڑیا تھی۔ کبھی بال کھول کر جوگنوں ایسا بہروپ بھر لیتی، اور کھڑکی کے پٹ سے لگی آہیں بھر ا

رتی۔ کبھی آئینہ سامنے رکھ کر گالوں پر سرخی تھوپنے لگتی۔ پھر احمی کو دیکھ کر شرما جاتی اور شوخی سے مسکرا کر پرے ہٹ جاتی اور کبھی دامن اٹھا کر چہرے کو ہوا کرنے لگتی۔ احمی کو اس نے پاگل بنا رکھا تھا۔ وہ رات کو اٹھ اٹھ کر بالکونی میں جاتا اور کھڑکی کی طرف منہ کرکے پہلے ٹھنڈی آہیں بھرتا، اور پھر اپنی نظر نہ آنے والی محبوبہ کو گالیاں دینی شروع کر دیتا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس عشق کا بھید ہماری منڈلی میں سب پر کھل گیا۔ مگر احمی نے اقرار نہ کیا۔ صوفی نے اسے یہاں تک کہہ دیا۔

"بیٹا عشق میں آہیں کیوں بھرتا ہے۔ اس سے عشق کیا ہے تو کم از کم اپنے کپڑے ہی مفت دھلوا لیا کرو۔ اگر تو حامی بھر لے تو خدا کی قسم آج رات وہ تیرے پہلو میں ہو"

لیکن احمی نے سوائے گالیوں کے اور کوئی جواب نہ دیا۔

سیمنز میں ہمیں بیٹھے ایک گھنٹہ گذر گیا تھا۔ ماؤ کافی کا تیسرا پیالہ چڑھا رہا تھا۔ دراصل آج کا بل جاوے نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اس لئے ہم سبھوں کے دل شیر ہو گئے تھے اور کافی پر خوب ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک کشیدہ قامت تیکھے نقش کی لڑکی چست قمیض میں ملبوس کانوں میں گولڈن رنگ اور ماتھے پر پوڈل کٹ بال ڈالے ہوٹل میں داخل ہوئی اور ایک میز پر اکیلی بیٹھ گئی۔ ہماری منڈلی میں ہر آدمی چپ ہو گیا۔ سب نے اپنی آنکھوں کے کیمرے اس لڑکی کی طرف فٹ کر لئے۔ ... کی پھولی ہوئی ناک پر باریک کمانی کی عینک تھرتھرا رہی تھی اور اس نے شہادت انگلی کو زور سے چٹخایا۔ ماؤ کے ہونٹ لٹک گئے اور آنکھیں اندر کو سکڑ گئیں۔ جاوا گردن کو جھٹکا دے کر جز جزایا۔ کشیدہ قامت حسینہ اپنے دھیان میں بیٹھی کافی پی رہی اس کا بسنتی پرس میز پر سامنے رکھا تھا۔ کھچی ہوئی بھنوؤں تلے نسواری رنگ کی درخشاں آنکھیں بڑی گہری محویت سے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ماؤ نے ... پر بکرے کی طرح زبان پھیرتے ہوئے اسے لقب عطا کر دیا۔

"آڈرے ہیپبرن!"

اچانک ماؤ کا رنگ بدل گیا۔ سر کے مختصر بال کھڑے ہو گئے اور اس نے قراری سے جو سانس لیا تو ناک میں سیٹی سی بج اٹھی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اس روز والی ہٹی کٹی عورت برجی باردت کی طرح بال بنائے اپنے بادامی رنگ کے ٹھنگنے کتے کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہو رہی ہے۔ ماؤ نے جاوے بھالو کو آہستہ سے کہنی ماری۔

"یہی عورت ہے جاوے۔ اسی نے مجھ غریب کو قتل کیا ہے۔"

موٹی عورت کاؤنٹر پر کھڑی کیک پیسٹری بندھوا رہی تھی۔ ٹھگنا بادامی کتا بار بار اس کی ریشمی شلوار کو منہ مار رہا تھا۔ اور وہ ہر بار اس کی زنجیر کھینچ کر اسے پیار سے جھڑک رہی تھی۔

"ڈونٹ بی سلی پوپی؟"

خواجہ نے چھنگلی چٹخاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بلا رہی ہے ماؤ۔"

اتنے میں اس نے چھوٹا سا پارسل تھام کر بل ادا کیا۔ اور کتے کی زنجیر سنبھالتی ہوٹل کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ ماؤ کے جسم میں ہیجان سا بپا ہو گیا۔ اسے اپنے سارے بدن پر چیونٹیاں رینگتی محسوس ہوئیں۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر ایک فلک شگاف سرد آہ بھری اور اپنی جگہ سے بے اختیار اٹھتے ہوئے بولا۔

"دوستو! اب تاب انتظار نہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنی موٹی چھیل چھبیلی...... محبوبہ کے پیچھے ہی ہوٹل کی سیڑھیاں اتر گیا

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جاوے بھالو نے ہوٹل واپس چلنے کا قصد کیا۔ اس کے مشروب کا وقت ہو گیا تھا۔ اب کے خواجہ نے اٹھنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کے سامنے پوڈل کٹ بالوں والی کشیدہ قامت آڈرے ہیپبرن بیٹھی کافی کے بعد پرس میں سے ایک کتاب نکال کر مطالعے میں محو تھی۔ جاوا بھالو بڑا سٹپٹایا۔

"تم سب دل پھینک عاشق ہو کمینو! ایک دن تم اپنے ساتھ مجھ شریف کو بھی تھانے پہنچاؤ گے۔"

اس نے بل ادا کیا اور ہم دونوں ہوٹل سلور کنگ والے اپنے کباڑ خانے میں

واپس آگئے۔ یہاں آکر ایک دوسرا عاشقانہ منظر دیکھا۔ احمی پلنگ کی اوٹ میں فرشی بستر پر اپنی دھوبن محبوبہ کے پاس بیٹھا اُسے ماؤ کے سوٹ کیس میں سے نکالے ہوئے بسکٹ کھلا رہا تھا۔

جاوا بھالو غصے میں آگیا۔

"میں یہ کبھی نہیں دیکھ سکتا کہ تم ایک غریب آدمی کی عزت خراب کرو۔ ایک شریف زادی کو خراب کرنا کہاں کی مردانگی ہے؟ میں یہ ناٹک یہاں نہیں چلنے دوں گا۔"

شریف زادی گول گول دیدے کھولے حیرت سے جاوے بھالو کی نرالی منطق سن رہی تھی۔ احمی نے غراتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہوتے ہو دخل دینے والے؟ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں" بھالو چیخا۔

بکواس بند کرو۔ ہم میں سے کوئی محبت نہیں کر سکتا، ہم صرف بدمعاشی کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاؤں گناہ کی دلدل میں دھنس گئے ہیں۔ نکل جا چڑیل یہاں سے.... اگر پھر قدم رکھا، تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ جوانی کا اتنا ہی زور ہے تو شادی کر لے۔"

احمی اٹھ کر کھڑا ہو گیا نشے میں جھول رہا تھا۔ اس نے جلدی سے پلنگ کا سہارا لے لیا

"میں اس سے شادی کر رہا ہوں جاوے۔"

"تم دوسرے ہی دن اسے طلاق دے دو گے۔ اس کے ساتھ کوئی دھوبی ہی بیاہ کرے گا۔ جاتی ہے یہاں سے یا دوں ایک گھونسہ؟"

لونڈیا چوہیا کی طرح پھدک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ باہر صوفی دروازے سے لگا یہ سارا ماجرا سن رہا تھا۔ وہ جلدی سے پرے ہٹ گیا۔ لونڈیا گیلری کے چرچراتے تختوں پر سنبھل سنبھل کر چلتی جب سیڑھیاں اترنے لگی تو صوفی نے اسے دبوچ لیا۔

"میرا حساب تو صاف کرتی جا۔"

احمی کو واقعی اس دھوبن کی لونڈیا سے عشق ہو گیا تھا۔ رات کو وہ زار وقطار رونے لگا۔ لونڈیا کا نام لے لے کر وہ سینہ کوبی کرتا۔ اٹھ اٹھ کر بالکونی کی طرف جاتا، اور رات

اندھیرے میں اپنی محبوبہ کے مکان کی طرف ہاتھ سے بوسے اڑاتا۔ میں اور جاوے ل کر بڑی مشکل سے اُسے بستر پر لٹا دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد احمی زور زور سے خراٹے رہا تھا۔

خواجہ اور ماؤ ابھی تک اپنی مہمات عشق سے پلٹ کر نہیں آئے تھے۔ ہم دونوں ہرنے لگے۔

"میں جانتا ہوں یہ اس لڑکی کو خراب کرنے پر تلا ہوا ہے محبت وغیرہ سب وسلہ ہے۔ اب دیکھو کیا گھوڑے بیچ کر سو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ مرد اتنا کمینہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ورغلا کر عورت کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔ ہر کنواری لڑکی اپنے خاوند کی امانت ہوتی ہے اس میں خیانت کرنے والے کی ردن قلم کر سکتا ہوں۔"

جاوا برانڈی میں پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ کافی نے بہت جلد ہمارے خون کو گرم کر اُس نے برانڈی اتار کر سرہانے رکھ لی۔ اس کی آنکھوں کی رنگت گلابی ہو رہی تھی۔ ائیں آنکھ کے نیچے کا مسہ مجھے نیلگوں دکھائی دینے لگا تھا۔

"گدھے کی طرح خراٹے لے رہا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پر بوتل دے ماروں۔ بار مجھے ایک عورت سے محبت ہو گئی۔ سالی نے کوئی ایسا منتر پھونکا کہ میں اس بیچھے باؤلا ہو گیا۔ میں نے سب برائیوں سے توبہ تلا کر لی اور اس سے شادی کرنے رہیں تھا، کہ حرافہ میری گھڑی اور ساری نقدی لے کر فرار ہو گئی۔ اب تو محبت کے سے رُوح کانپ جاتی ہے اور میری ایک بات تم بھی یاد رکھنا شریف عورت پر نظر نہ ڈالنا۔ اب میری طرف ہی دیکھو... عورت کے نام پر میری جان جاتی ہے۔ خدا کی قسم شریف عورت سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ اس قدموں سے پالتو کتے کی طرح لپٹ جاؤں۔"

ٹھیک آٹھ بجے خواجہ صاحب تشریف لے آئے سردی میں منہ نیلا ہو رہا تھا، بالوں پر پانی کے قطرے جم رہے تھے، معلوم ہوا باہر بوندا باندی ہو رہی ہے۔

آپ گھنٹہ بھر اپنی متوقع محبوبہ آڈرے ہیبرن کے سامنے ہوٹل میں بیٹھے رہے،
پیچھے پیچھے اس کے کالج تک گئے۔ دیر تک کالج کے ارد گرد منڈلاتے رہے۔ ا
کو بھی شبہ ہو گیا تھا، کہ آپ اس پر لٹو ہو گئے ہیں۔ تفریح طبع کیلئے وہ بھی گھر کے راہ
میں دو ایک بار مڑ کر انہیں دیکھتی رہی۔ کالج میں داخل ہونے کے بعد اس نے ایک
کھڑکی سے باہر دیکھا، خواجہ صاحب کو یقین ہو گیا کہ محبت ٹھن گئی ہے۔ جلدی سے
کا ایک پھول توڑ کر لڑکی کی طرف اچھال دیا۔ لڑکی نے غصے اور نفرت سے آپ کی ط
دیکھا، آپ مسکرا دیئے لڑکی نے پاؤں سے سینڈل نکال کر دکھائی اور ماتھے کے بال
کر کھڑکی بند کر کے چلی گئی۔ لیکن یہاں آ کر انہوں نے جو بیان دیا وہ یہ تھا۔

"آپ لوگ چلے آئے تو میں اٹھ کر اس کی میز پر جا بیٹھا۔ میں نے اسے کافی
دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کر لی۔ کافی دیر تک موسم کی اور فلموں کی باتیں ہ
پھر ہم وہاں سے اٹھے اور سیکنڈل پوائنٹ کی جانب سیر کرنے نکل گئے

سارا وقت جاوا بھالو خواجہ کی باتیں سنتے ہوئے دانتوں سے انگلیاں
کترتا رہا۔ جب خواجہ نے اپنی رام کہانی ختم کی تو جاوے نے گلاس حلق میں انڈیل
زور دار ڈکار لی اور کباب منہ میں ڈال کر بولا۔

"میں تیری ایک ایک رگ سے واقف ہوں خواجہ! تو جھوٹ بول رہا ہے

ایک گھنٹہ بعد ہمارے یار ماؤ تشریف لائے تو پانی میں نچڑے ٹھٹھر رہے تھے
معلوم ہوا کہ باہر باقاعدہ پانی برسنے لگا ہے۔ آپ نے جلدی جلدی کپڑے اتارے
دھوتی بنیان پہنی۔ کمبل اوڑھا اور میرے پاس پلنگ پر آ کر اکڑوں بیٹھ گئے۔
اپنی محبت کی داستان سنانی شروع کر دی۔

"دوستو! مجھ سے کوئی سی قسم لے لو۔ اس قتالہ جہاں نے کل رات
پر اپنے گھر بلایا ہے۔ جاوے! اپنا نیلا سوٹ کل تیار رکھنا ٹائی خواجہ کی بڑی
گی۔ الٰہی توبہ! ایسی عورت نہ دیکھی نہ سنی۔ ارے جاوے! وہ تو مجھ پر فدا ہو
کہنے لگی۔

"پیارے! تم پہلے کہاں تھے؟"
میں نے کہا۔
"تمہارے قدموں میں۔"
"غضب خدا کا! پہلی نظر کا عشق بھی کیا بلا ہوتا ہے۔"
جاوے نے ماؤ کی گنجی چندیا پر دھول جما کر کہا۔
"اس نے اپنے دلیپ کمار کی گنجی کھوپڑی نہیں دیکھی کیا؟"
"تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو؟ میں نے سر مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا۔"
ماؤ نے مشتعل ہو کر دانت بھینچ لئے اور منہ اور ناک سے عجیب و غریب قسم کی
آوازیں نکالنے لگا۔
"گھبراؤ نہیں دوزخ کے دروازے پر ہم تمہارا انتظار کریں گے۔"
آخر ماؤ سچی بات بتانے پر مجبور ہو گیا۔ کہنے لگا۔
"یہاں محبت کرنے کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے خواجہ! یہاں سب سنگدل ہیں۔
پیار کا ہاتھ بڑھاؤ لوگ کتے چھوڑ دیتے ہیں۔ کتوں سے پیار کرو ستم گر تھانے بھجوا دیتے
ہیں۔ میں تو جوگیوں کا بھیس بدل کر کاغان کی چوٹیوں پر جا رہا ہوں۔ دوستو! میرے گھر
خبر کر دینا...... میرا سر گنجا ہو گیا ہے میں پہلے سے زیادہ بدصورت ہو گیا ہوں۔ چار
بچے پیدا ہو چکے ہیں۔ پانچواں بھی ہو جائے گا۔ ہر صبح منہ پر پھٹکار پڑی ہوتی ہے۔ دنیا
میں مشروب ہی ایک سہارا ہے۔ بیوی کو بچوں سے فرصت نہیں ملتی ہے وہ میری
نہیں، میرے بچوں کی بیوی ہے، اور میں در در مارا پھرتا ہوں، اور وہ سالی موٹی عورت
...... اس نے اپنا کتا میرے پیچھے چھوڑ دیا۔ خواجہ! بیوی بڑی پیاری شے ہوتی ہے
نامردوں کو صرف بیویوں سے محبت کرنی چاہیئے۔ ارے لعنت ہے مجھ پر...... ہزار
لعنت! بیوی کے تین خط آئے ہیں۔ ایک کا بھی جواب نہیں لکھا۔ کیا لکھوں؟ مری
میں پناہ لینے آیا تھا۔ یہاں بھی سکون نہیں مل سکا۔ کہاں جاؤں؟ کدھر کو جاؤں...؟"
ماؤ کو بہت زیادہ چڑھ گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر نیلی جھاگ جم رہی تھی۔

آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں چہرے کی چھائیاں زیادہ گہری ہو گئی تھیں۔ وہ پلنگ
اٹھ کر دھوتی بنیان میں کمرے میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح چکر کھانے لگا۔ ہم سب نے
مل کر اسے بمشکل سنبھالا۔ ہمارے قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ اگر خواجہ وہاں نہ ہوتا تو
شاید ہم سب نے مل ملا کر اپنا بُرا حال کر لیا ہوتا۔ ماؤ نے دیوار سے لگے آئینے میں اپنی
دیکھی تو چیخ مار کر رونے لگا۔

"یہ کسی ریچھ کا چہرہ ہے۔ یا اللہ! مجھے معاف کر دینا۔"

احمی بے سدھ ہو کر سو رہا تھا۔ شاید خواب میں لونڈیا سے عشق لڑا رہا تھا۔ ماؤ
پر لوٹنے لگا۔

"میرے بچے بھی بڑے ہو کر مشروب پئیں گے۔ میں اُن کے لئے کچھ نہیں کر رہا
بڑھاپا وقت سے پہلے مجھے آنکھیں دکھلانے لگا ہے۔" خواجہ نے بڑی مشکل کے ساتھ
کو احمی کے پاس اس کے بستر پر لٹا دیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ بستر پر سر مارتا رہا اور اپنی بیو
بچوں کو یاد کرتا رہا۔ پھر سو گیا۔ بے خبر ہو کر۔

اب کمرے میں صرف جاوا، میں اور خواجہ تھے۔ خواجہ کو چونکہ معلوم ہو گیا تھا کہ
رات دیر تک دور چلے گا۔ اس لئے وہ بڑے اطمینان سے کپڑے بدل کر اپنے بستر میں گھ
گیا تھا۔ جاوے کا نشہ کچھ کچھ اتر گیا تھا۔

وہ ایک بار پھر موج میں آ رہا تھا۔ احمی اور ماؤ گہری نیند سو رہے تھے۔ تھوڑی
دیر بعد خواجہ کے خراٹے بھی گونجنے لگے۔ جاوے نے بڑی پھرتی سے ٹھنڈا کباب منہ
رکھا اور اُسے بے دلی سے چبانے لگا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور بالکونی کے نیچے تنگ
گلی میں اس کے گرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جاوے نے برانڈی
گھٹنوں پر ڈال رکھی تھی اور پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے مزے
آہستہ آہستہ کباب چبا رہا تھا۔ بند کمرے میں بھنے ہوئے گوشت اور تمباکو کی ملی جلی
پھیلی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں بھی جل رہی تھیں۔ میں نے نیا سگریٹ سلگایا۔
جاوے نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی

تھیں۔ ایک سگریٹ لے کر جاوے نے سلگایا بولا۔

"ہر بدکاری اپنے پیچھے ندامت کی ایک تیز دھار والی لکیر چھوڑ جاتی ہے جو انسانی
شخصیت کو دو ٹکڑوں میں کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اور زنا سے بڑھ کر دنیا میں کوئی برائی
ایسی نہیں۔ جس کا خمیازہ آدمی کو اتنی جلدی بھگتنا پڑتا ہو —— ہمیں اس عظیم کام
کے لئے اپنے ضمیر کو بہت بھاری رشوت دے کر اس کا منہ بند کرنا پڑتا ہے۔ یہ عفریت
ناجائز کمائی پر پل کر اندر ہی اندر تنومند ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پھر ہمیں صرف اس
کی خوراک مہیا کرنے کی خاطر برائی کرنی پڑتی ہے ہم اس عفریت کے ہاتھوں میں کھلونا بن
کر کھیلنے لگتے ہیں۔ جس طرح جھوٹے کا الہام بھی جھوٹا ہوتا ہے۔ اسی طرح عادی بدکار کا
ضمیر بھی بدکاری میں ملوث ہو کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اچھائی کے راستے سے بھٹکا دیتا
ہے۔ یہاں انسان کی عقل اور تدبر سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہاں صرف خدا کی رحمت
ہی کام آتی ہے۔ میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں شادی کے لائق ہی نہیں
رہا۔ اب تو میں کسی نیک بی بی کو اپنی بیوی بنا کر اُسے عزت و تکریم کا وہ مرتبہ نہ دے
سکوں گا جس کی وہ مستحق ہے۔ جب کبھی میں کسی شادی شدہ جوڑے کو بازار میں گزرتا یا باغ
میں اپنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ سیر کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ منظر دنیا کے تمام نظاروں
سے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ہماری سوسائٹی اس سے زیادہ خوبصورت منظر آج تک پیش
نہیں کر سکی۔ سوچتا ہوں میں بھی شادی شدہ ہوتا تو میرا بھی ایک پیارا سا بچہ ہوتا۔ میں بھی دن
بھر کے کام سے تھکا ہارا گھر میں داخل ہوتا تو کوئی محبت اور عقیدت بھری نگاہوں سے میرا
خیر مقدم کرتا۔ پھر سوچتا ہوں شاید مجھے کوئی حق نہیں کہ میں کسی شریف لڑکی سے شادی کر کے
اس کی زندگی کو جہنم بنا دوں میں ایک شریف گھرانے کی دہلیز سے لڑھک کر گندی نالی میں
اور وہاں سے گندے بدرو میں آ گیا ہوں۔ باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں تو اور دھنستا چلا
جاتا ہوں بے بس اور بے خبری کے عالم میں بہا جا رہا ہوں اب تو بہت بڑے سمندر کی اس
غضبناک لہر کا انتظار ہے جو ایک ہی تھپیڑے سے مجھے دھو دھلا کر پھر سے پاک کر دے گی۔"

سگریٹ پیتے ہوئے جاوے کے منہ میں تمباکو آ گیا تھا وہ دیوار کی طرف منہ کر

کے تھوکنے لگا۔

دیکھو حرامی گھوڑے بیچکر سو رہے ہیں۔ کیوں یار یہ نیند کیا بلا ہے؟ سو جاؤ او پھر جانے کیا کیا خواب آتے ہیں، اُف!..... سر چکر کھا گیا ہے۔،،

ایک دم دروازہ دھڑاک سے کھلا اور گرم لمبے کوٹ اور مفلر میں ٹھنسا ٹھنہ چھوٹے سر والا صوفی نمودار ہوا دونوں ہاتھ زور سے رگڑتے ہوئے اس نے نعرہ لگا

"آخاہ! پارٹی پوری ہے۔"

جاوا دانتوں میں پھنسا ہوا گوشت نکالتے ہوئے لال لال آنکھوں سے اُسے گھورتا رہا اور کچھ نہ بولا۔

۵

غزیب لڑکی کا عشق احمی کے سر پر بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ وہ ہر رات لونڈیا سے لنے چھپ کر اس کے گھر جایا کرتا وہ رات کے بارہ بجے اپنی کھڑکی میں لیمپ جلا کر بجھا یتی یہ میدان صاف ہونے کا سگنل تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گھر والے سب سو گئے یں۔ اب آجاؤ پیارے...... احمی بالکونی میں کھڑا لیمپ کی ایک جھلک دیکھنے کے یے ٹھٹھر رہا ہوتا۔ وہ کمبل اوڑھ کر جلدی سے باہر نکل جاتا اور پچھواڑے کی گلی پھاند کر لیدھا واڑے میں پہنچ جاتا۔ یہ ترکیب اسی عشق کی متوالی کے ذہن میں آئی تھی۔ وہ اپنے مکان کے عقب میں گھاس پھوس سے [illegible]ی ہوئی کوٹھڑی میں اپنے محبوب کے انتظار یں چشم براہ ہوتی۔ گھنٹہ بھر وہ وہاں بیٹھے جی بھر کر باتیں کرتے اور پھر کل کے وعدے پر بدا ہو جاتے۔ جاوا اسے اور خبردار کرتا۔

"بیٹے یاد رکھو، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو اس کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔ چھٹی کا دودھ یاد نہ آئے تو جاوا نام نہیں۔"

مگر احمی منہ زور گھوڑے کی طرح عشق کی راہ میں سرپٹ دوڑے جا رہا تھا۔ وہ اس قسم کی باتیں سن کر ہنس کے ٹال دیتا۔ آخر جوانی کی حماقتیں رنگ لے آئیں دھوبن لونڈیا کا ایک رات رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے روتے ہوئے احمی کو بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے ہائے اللہ! اب کیا کروں.... احمی! احمی!.... مجھ سے شادی کر لو۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

شادی کا نام سن کر احمی کا حلق خشک ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ گدھوں پر گند
مندے کپڑوں کے گٹھر لادے دھوبی گھاٹ کو جا رہا ہے، اور ایک بکروہ صور
پلا اس کے ساتھ ریں ریں کرتا چل رہا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا
"تم چپ کیوں ہو گئے احمی؟ اگر تم نے شادی نہ کی تو میں تجھے کبھی معاف نہیں کر
گی۔ میں تباہ ہو جاؤں گی۔"

احمی کے پاؤں تلے سے تو زمین نکل گئی۔ پہلی آنکھوں کا پانی خشک ہوگیا۔ عشق
کا بھوت بھاپ بن کر اڑ گیا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ صبح منہ اندھیرے
ہی وہ بوریا بستر باندھ کر وہ مری سے بھاگ جائے گا۔ احمی نے گردن اکڑا کر اپنی دھو
معشوقہ کو تسلی دی۔

"گھبراؤ نہیں، تمہارا ہاتھ پکڑا ہے تو چھوڑوں گا نہیں۔ میں کل ہی تم سے شادی
لوں گا۔ لیکن یہ شادی کہاں ہوگی، کیسے ہوگی؟"

بدنصیب دھوبن کا چہرہ ایک دم چمک اٹھا۔

"تم فکر نہ کرو۔ ہم یہاں سے بھاگ کر ڈھونگا گلی اپنی خالہ کے پاس چلے جائیں گے
وہ میری راز دار ہے۔ ہم وہاں شادی رچالیں گے۔ باقی گھر کا معاملہ خالہ خود سنبھال ل
گی۔ کل رات کو تم تیار رہنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

احمی نے بڑے زور شور اور پورے اعتماد سے کل ڈھونگا گلی جا کر شادی کر لینے کا ع
کیا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہاں سے واپس چل پڑا۔ ہوٹل میں آکر وہ بے
جان پتھر کی طرح اپنے ٹھنڈے بستر پر گر پڑا۔ اس نے گھڑی دیکھی اس وقت رات کے
پورے دو بج رہے تھے، اور راولپنڈی کو پہلی بس پانچ بجے چھوٹتی تھی۔ کمرے میں
سارے گہری نیند میں سو رہے تھے۔ احمی نے باقی رات بستر پر لیٹے لیٹے سگریٹ
پھونکتے گذار دی۔ جب بالکونی کے باہر کھڑکی کے شیشوں میں صبح کی نیلی جھلکیاں
نمودار ہوئیں تو وہ آہستہ سے اٹھا۔ بستر بغل میں دبا کر اٹیچی کیس ہاتھ میں لیا اور سب
کو سوتا چھوڑ کر چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ سیڑھیاں اترتے اُسے بیرا ملا۔ جو

آنکھیں ملتا اوپر آ رہا تھا۔ احمی نے اس کے سر پر سامان لادا اور بسوں کے اڈے
پر آ گیا۔ پانچ بجے والی بس تیار کھڑی تھی۔ سامان بس کی چھت پر رکھوا کر اس نے پنڈی
کا ایک ٹکٹ کٹوایا۔ بیرے کو ایک روپیہ دیا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر
بعد بس راولپنڈی کی طرف فراٹے بھرتی اڑی جا رہی تھی۔ احمی نے آنکھیں بند کر کے
سر کھڑکی سے لگا رکھا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پھول سے بھی زیادہ ہلکا پھلکا محسوس کر
رہا تھا۔

ادھر جب دن چڑھا تو سب نے دیکھا کہ احمی اپنے بستر اور اٹیچی کیس سمیت
غائب ہے۔ بیرے نے بتایا کہ صاحب پہلی بس سے پنڈی چلے گئے ہیں۔ ماؤ گنجی
چندیا پر ہاتھ پھیر کر حیرت سے بولا۔

رات کو تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک سویا تھا۔

خواجہ نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور سگریٹ بنانے لگا۔

"مگر اُسے بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔"

جاوا دروازے کے پاس کھڑا شیو بنا رہا تھا۔ منہ میں آیا ہوا جھاگ تھوک کر بولا
"میں جانتا ہوں کیا ہوا ہے۔ کل تک تم لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ ابھی
سے اپنا ٹھکانہ کر لو۔ ہوٹل پر مصیبت آنے والی ہے۔"

گول مٹول کمزور دل ماؤ کا تو رنگ اُڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی دکھی بیوی اور
بچوں کی شکلیں گھوم گئیں۔ خواجہ کی پھولی ہوئی ناک پر باریک کمانی والی عینک تھرتھرا
اٹھی۔ مجھے بھی اپنا فکر دامن گیر ہوا۔ ماؤ نے فکر مند چہرہ اٹھا کر کہا۔

"آخر کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ۔"

چنانچہ ایک دن بعد سارا بھید کھل گیا۔ صوفی دوڑا دوڑا پریشانی کے عالم میں
ہمارے کباڑ خانے میں آیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"نیچے سپاہی آیا ہے۔ یہ کمینے احمی نے کیا گل کھلا دیا۔ وہ مجھ سے احمی کا اتا پتا
پوچھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ محلے کا چوہدری بھی ہے۔"

جادے نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔ ماؤ ایک دم زرد ہوگیا۔ خواجہ کی پھولی ہوئی ناک سکڑ گئی۔ ماؤ کھڑا بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ وہ کنگھی چھوڑ کر بیدم سا ہو کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"اب کیا ہوگا؟"

صوفی بولا۔

"یہی تو میں پوچھنے آیا ہوں۔"

خواجہ نے کہا۔

"اُسے کہہ دو احمی نام کا کوئی آدمی یہاں نہیں ہے ایک مسافر آیا تھا۔ وہ جا چکا ہے۔ اس کا پتہ غلط سلط لکھوا دو۔"

صوفی نے پانی کا گھونٹ پیا اور گھبراہٹ میں بولا۔

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ پولیس کا معاملہ ہے کہیں تھانے لے جا کر ٹھکائی نہ کریں۔"

جادا بھالو قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ صوفی نے اُسے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا۔

"میری جان پر بنی ہے اور تو ہنس رہا ہے۔ سالو نہ تم یہاں آتے نہ مجھے یہ مصیبت پڑتی۔ وہ کمینہ جاتے جاتے کمرے کا کرایہ بھی ہضم کر گیا۔ یا اللہ اب کیا کروں؟"

جادا بولا۔

"پیارے خواجہ نے جو تمہیں کہا ہے وہی کرو۔ رام بھلی کرے گا۔"

ہم سبھوں نے کہہ سن کر جادے کو راضی کیا کہ وہ صوفی کے ساتھ نیچے جا کر پولیس والے کو سمجھا بجھا کر رخصت کرے اور اس بن بلائی بلا کو ہمارے سر سے ٹالے۔ جادے نے نیچے جا کر سپاہی کو بتایا کہ ہمارے کمرے میں احمی نام کا کبھی کوئی آدمی آکر نہیں ٹھہرا۔ صوفی نے بیان درج کروا دیا کہ اس نام کا مسافر ہوٹل میں آکر ٹھہرا ضرور تھا۔ لیکن وہ اپنا اتا پتا بتائے بغیر حساب چکا کر پرسوں یہاں سے جا چکا ہے۔

سپاہی نے بیان لکھ لیا۔ چائے کے دو پیالے پی کر پورا ایک ہڑپ کر گیا جاتے ہوئے اتنا کہہ گیا۔

"ہو سکتا ہے آپ کو ایک بار تھانے آنا پڑے۔"

تھانے کا نام سن کر صوفی کے پران خشک ہو گئے۔ لیکن اس وقت تو اس نے سپاہی کے چلے جانے پر کلمۂ شکر ادا کیا۔ اسی رات صوفی نے انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کے جائے پی کر احمی کو وہ مغلظات سنائیں کہ اگر وہ موجود ہوتا تو صوفی کا کچومر نکال دیتا۔ اندر سے وہ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ اُسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ اب تھانے سے بلاوا آیا کہ آیا۔ اتفاق سے سی آئی ڈی کا ایک کارندہ ساتھ والے ہوٹل میں چائے پینے آ نکلا۔ صوفی کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب اس کے ہوٹل کی خیر نہیں۔ وہ بھاگم بھاگ یہ رپورٹ پہنچانے ہمارے کباڑ خانے میں آگیا۔ ماؤ جو پہلے ہی ڈرا ہوا تھا سی آئی ڈی کا نام سن کر چکر میں آگیا۔ اُسے اپنی ریلوے کی نوکری ہاتھ سے جاتی نظر آئی۔ وہ تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اسی لمحے اعلان کر دیا، کہ کل صبح پہلی بس پر وہ بھی لاہور کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ خواجہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا۔

"تم لاہور جا رہے ہو۔ جادا انتھیا گلی چلا جائے گا۔ پھر میں یہاں رہ کر کیا کروں گا۔"

صوفی سر پیٹ کر رہ گیا۔

"میری جان کے دشمن ایک ایک کر کے سب کھسک رہے ہیں۔ اچھا دوستو! چلے جاؤ۔ میرے سر پر جو آن پڑی ہے وہ اکیلا ہی بھگتوں گا۔"

جادا بھالو صوفی کو دھکا دے کر بولا۔

"مرے کیوں جاتے ہو۔ میں ابھی یہیں ہوں۔"

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن مری سے راولپنڈی کی جانب جو پہلی بس اتر رہی تھی اس میں خواجہ ونگبر اور ہمارا گول مٹول یار ماؤ دونوں بیٹھے تھے۔ خواجہ حسبِ عادت انگلیاں چٹخ رہا تھا اور ماؤ سکڑی ہوئی آنکھوں کی درزوں میں سے باہر وادی کے چیڑ کے درختوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ اب اس کمرے میں صرف میں اور جادا رہ گئے۔

خواجہ اور ماؤ کے چلے جانے کے ایک ہفتہ بعد تک دھوبن کا قصہ اپنے آپ ختم ہو گیا۔ صرف ایک دفعہ صوفی کو تھانے بلوایا گیا۔ وہاں جا کر صوفی نے اپنا پہلے

والا بیان دہرا دیا۔ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ اور ہوٹل سلورکنگ پھر اپنی پرانی ڈگر پر چل
پندرہ بیس دن اور گذر گئے۔ صوفی سب کچھ بھول بھلا کر ایک بار پھر اپنی ریشہ دوا
میں مصروف ہوگیا۔

مری کا موسم کافی سرد ہوگیا تھا۔ بارشیں ختم ہوچکی تھیں۔ دن بھر ٹھنڈی یخ خ
آلود ہوائیں چلا کرتیں۔ ہمارا کام اب صرف تاش کھیلنا، سیمز ہوٹل یا لفٹ میں بی
سڑک کا نظارہ کرنا اور رات کو نیم اجاڑ سڑکوں پر مٹر گشت کرنا ہی رہ گیا تھا۔ دو
تیسرے کمرے میں جاوے کی محفلِ نشاط بھی لگ جاتی۔ رات گئے تک شعر و نغ
کا دور چلتا جس میں انشورنس کمپنی کا ایجنٹ اور صوفی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ جا و
بھالو کی حالت اب انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس دلدل سے نکلنے
کوشش میں اس میں اور دھنستا جا رہا ہے۔ کبھی وہ بچوں کی طرح رونے لگ جاتا
وقت میں حیران ہوتا کہ اِس ہاتھی ایسے ڈیل ڈول والے آدمی میں اتنی نازک اور
شے کی سمائی کیسے ہوگئی۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ اچانک بارش ہوکر بادل چھٹ گئے اور سرد ہوا
دانت بجنے لگے۔ اس روز جاوے کا محفلِ نشاط کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ہم سیر کر
ہوئے نیچے سنی بنک کی طرف نکل گئے۔ کافی دُور تک سیر کرنے کے بعد جب ہم
آئے تو ہمارے جسم گرم ہوچکے تھے، اور ماتھوں پر پسینہ آگیا تھا، رات کے دس
چکے تھے اور سڑکیں تقریباً ویران ہوگئی تھیں۔ بسوں کے اڈے پر خالی بسیں چپ
چاپ کھڑی سردی میں ٹھٹھر رہی تھیں۔ بکنگ کے پاس دو ایک مزدور آگ جلا کر
چائے پی رہے تھے۔ ہم لوہے کے جنگلے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سڑک
گھومنے لگے، تو ہمیں ایک آدمی نے روک لیا۔

"کیوں جناب پنڈی سے آخری بس کب آتی ہے؟"

ملگڑی کے خاکی کمبل میں لپٹے ہوئے دُبلے پتلے آدمی کی آنکھیں اندھیرے میں
ہوئے دیئے کی طرح ٹمٹما رہی تھیں۔ اس کی آواز میں تجسس اور نا امیدی کی جھلک

"پنڈی سے آخری بس تو کبھی کی آچکی ہے۔ کیوں۔ بات کیا ہے؟"

جاوے نے پوچھا۔ وہ آدمی آہنی جنگلے کا سہارا لے کر بولا۔

"جناب میری بیوی راولپنڈی سے آخری بس میں آرہی تھی۔"

میں نے پوچھا۔

"تم اُس وقت اڈے پر نہیں آئے؟"

"مجھے صمد و چاچا نے ابھی ابھی بتایا ہے۔ کہنے لگا۔ بیٹے میرا حافظہ کمزور ہے۔ میں تمہیں شام کو بتانا بھول گیا تھا۔ اب کیا کروں جناب؟ اگر وہ آگئی ہو تو بے چاری کہاں ہوگی۔"

"تم کہاں کام کرتے ہو؟"

"جی میں ٹی کمپنی میں چپڑاسی ہوں اور لوئر بازار والے دفتر میں رہتا ہوں۔ میری بیوی کا رنگ سانولا ہے، اور داہنے گال پر آنکھ کے نیچے زخم کا نشان ہے۔"

جاوے نے کہا۔

"بھائی اب کیا ہوسکتا ہے۔ تم جاکر آرام کرو۔ اب تو صبح کو ہی معلوم ہوسکے گا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تمہاری بیوی پہنچی ہی نہ ہو۔"

"نہیں جناب ..... میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ ضرور آئی ہے۔ ہماری شادی ہوئے ابھی تین ماہ ہی تو گذرے ہیں جناب ......"

ہم اس پریشان انسان کو یونہی بے معنی دم دلاسا دے کر اپنے ہوٹل میں آگئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مری کا سارا شہر ایک کمبل پوش بے چین انسان کے روپ میں دیوانوں کی طرح بس کے اڈوں پر اپنی نئی بیاہتا بیوی کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی جاوے نے حسبِ عادت ہاتھ اٹھا کر سگریٹ جلایا اور باہر بالکونی میں مفلر اوڑھ کر ٹہلنے لگا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا اور صوفی نے چوروں کی طرح اندر داخل ہوکر دروازہ پھر سے بند کردیا۔ جاوے نے گردن کھجلاتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں اوئے ..... کیا پھر کوئی آفت آن پڑی ہے؟"

صوفی آنکھ مار کر مکارانہ ہنسی ہنسا۔

"آفت نہیں..... آفت کی پُرکالہ ہے۔"

"کہاں ہے؟"

صوفی نے ہمیں اشارے سے بلا کر کہا۔

"۷ نمبر کمرے میں ہے۔ میرے پیچھے پیچھے چپکے سے چلے آؤ۔"

سات نمبر کمرے میں ٹوٹی ہوئی میز پر صرف ایک موم بتی جل رہی تھی۔ جس کی دُ
دھیمی پراسرار روشنی میں ایک عورت گٹھڑی بنی پلنگ پر ایک طرف سمٹی بیٹھی تھی۔
جاوے نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ فرش پر کھڑے کھڑے جھول
رہا تھا جیسے کوئی بحری جہاز کا کپتان ڈولتے ہوئے جہاز کے عرشے پر کھڑا ہو۔ کمرے
میں ہولے ہولے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ عورت رو رہی ہے

عورت کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے
لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب اس کے جو ہچکی بندھی تو تھمنے کا نام ہی
لیتی تھی۔ جاوے نے جھنجھلا کر صوفی سے پوچھا۔

"یہ چڑیل کہاں سے اٹھا لائے ہو تم؟"

کہتی تھی میں اپنے خاوند سے ملنے آئی ہوں۔ میں نے کہا ہم بھی تو تیرے خاوند
ہی ہیں۔"

جاوے کو جیسے بجلی کا ہلکا سا جھٹکا لگا۔

"خاوند سے ملنے آئی ہے۔ کون سی بس سے اتری تھی؟"

"آخری بس کا کہہ رہی تھی۔ مگر ہم ان اڑن گھائیوں میں آنے والے ہیں بھلا!"

جاوے کو جیسے ایک جھٹکا اور لگا۔ اس نے عورت سے پوچھا۔

"تم پنڈی سے آئی ہو؟"

"جی۔" عورت کی آواز ہچکیوں میں دبی ہوئی تھی۔

"تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"تین مہینے!"

"تمہارا خاوند چائے کمپنی کے دفتر میں چپڑاسی ہے۔"

"جی۔" اور عورت بے اختیار رونے لگی۔

جاوا ایک دم اچھل کر پلنگ سے پرے ہٹ گیا۔ اس نے تیزی سے موم بتی اٹھا
کر عورت کے منہ کے آگے کر دی۔ داہنے گال پر آنکھ کے نیچے زخم کا نشان آنسوؤں میں
بھیگ رہا تھا۔ جاوے کے ہاتھ سے موم بتی زمین پر گر پڑی۔ صوفی چیخا۔

"یہ کیا کر دیا۔ تم ہوٹل میں آگ لگا دو گے۔"

صوفی نے جلدی سے بتی جلا دی۔ روشنی میں جاوا بھالو جیسے ایسی غضبناکی کے
ساتھ صوفی پر جھپٹا۔ اس نے پاگلوں کی طرح صوفی کو لاتوں اور گھونسوں سے کوٹنا شروع
کر دیا۔ صوفی تو ششدر رہ گیا۔ اس کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ بس میدے کی بوری کی طرح
پیٹ پکڑ کر فرش پر گر پڑا۔ اور پھر نہ اٹھ سکا۔ جاوے نے آگے بڑھ کر فرش پر گرا ہوا دوپٹہ
اٹھایا۔ دوسری طرف منہ کر کے اپنے ہاتھ سے اس بدنصیب عورت کے سر پر ڈالتے
ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"برقع پہن کر میرے ساتھ آؤ بہن۔ میں تجھے تیرے خاوند کے پاس پہنچا دیتا ہوں۔"

عورت ہکی بکی رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ایک دم کایا پلٹ سی
کیسے ہو گئی۔ اس بدقماش کے اندر سے نیک دل بھائی کہاں سے نکل آیا؟ اس نے جلدی
سے اپنا سفید سیدھا برقعہ اوڑھا اور ہمارے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل آئی۔ رات کے
اندھیرے میں ہم نے لوئر مال کی اونچی نیچی اترائی سنبھل سنبھل کر طے کی جاوا سارا راستہ کچھ
نہ بولا۔ ہونٹ بھینچے، ہاتھ خاکی برانڈی کی جیبوں میں ٹھنسائے بالکل چپ چاپ چلتا
رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ٹی کمپنی کی بینگی ٹیڑھی عمارت کے نیچے کھڑے دستک دے رہے
تھے۔ کابک نما دفتر کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف ایک کھڑکی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی
تھی۔ غم نصیب غریب خاوند دیا جلائے اپنی نو بیاہتا بیوی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کسی نے
بڑی بے تابی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہی کمبل پوش دبلا آدمی کھڑا تھا۔ اس کی

بیوی بھاگ کر اس سے جا لپٹی، اور اس کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ خاوند کی آنکھ
میں بھی آنسو آ گئے۔ جاوے نے صرف اتنا کہا، اور اس کی اپنی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"میں تمہاری بیوی کو نہیں اپنی بہن کو اس کے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں۔"

جاوا جلدی سے مجھے ساتھ لے کر لوئر بازار کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ ٹی کمپنی کا چپڑا
ہمیں دیکھتا ہی رہ گیا۔

ہوٹل میں واپس آکر جاوے نے کہا۔

"اب میں یہاں نہیں رہ سکتا میں کل صبح ہی نتھیا گلی چلا جاؤں گا۔"

اس کے بعد وہ پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔

"بتی بجھا کر تم بھی سو جاؤ۔"

میں نے بتی گل کر دی اور بستر میں گھس کر لحاف اوپر کر لیا۔ اندھیرے میں مجھے
تک کچھ اس قسم کی آواز سنائی دیتی رہی جیسے جاوا سسکیاں بھر رہا ہو۔

کیا وہ رو رہا تھا؟

شہر اور گلیاں

زرد چاند میں رہنے والی اداس لڑکی
میں تمہاری ڈائری کے یہ پریشان اوراق
تمہارے ہی نام معنون کرتا ہوں

اس وقت میں چپ ہوں ۔ خاموش ہوں ۔ یوں لگتا ہے ۔ جیسے کسی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے قوت گویائی چھین لی ہے ۔ جیسے یہ ہونٹ زنگ آلود تلعے کے دروازے کی مانند بند ہو چکے ہیں ۔ اور اب کبھی نہ کھلیں گے میری آنکھوں میں آنسو ہیں ۔ اور میرے دل کا ہر درد جاگ اٹھا ہے ہر زخم رِس رہا ہے اور ٹیسیں اٹھ رہی ہیں ۔ اور میں پاگلوں کی طرح کھوئے کھوئے قدم اٹھائے اس ویران اور خاموش پگڈنڈی پر چلی جا رہی ہوں ۔ یہ پگڈنڈی دونوں طرف سے درختوں سے گھری ہوئی ہے ۔ اور ٹہنیاں سر جھکائے چپ چاپ سوچ رہی ہیں آج ہر جانی پہچانی چیز اجنبی نظر آ رہی ہے ۔ یہ وہی راستے ہیں جہاں سے میں روزانہ گزرا کرتی ہوں ۔ یہ وہی پہاڑ ہیں ۔ جو مہربان محافظوں کی طرح سینہ تانے کھڑے روزانہ راستے میں مجھے ملا کرتے تھے ۔ مگر آج میں ان کو قطعاً نہیں پہچان رہی ۔ یہ آبشار جو کل تک میٹھے میٹھے راگوں سے بھرپور تھا ۔ آج اپنا سر پتھروں سے کیوں پٹخ رہا ہے ۔ وہ شفقی ۔ ۔ ۔ ۔ زمردی ۔ ۔ ۔ ۔ نارنجی ۔ ۔ ۔ ۔ فیروزی ، کاسنی اور سرمئی رنگ کے بادل یہاں سے چلے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن وادیوں میں

اُتر گئے! وہ رنگ یہاں اڑ گئے ۔ وہ سورج یہاں ڈوب گیا ہے...
جو کل تک آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ یہ ایک ہی دن میں کیا ہو گیا
ہے۔ وہ دل کشی، وہ رعنائی کہاں کھو گئی..... زندگی کی چمک.....
روشنی..... اور رسیلاپن کیوں مٹ گیا! وہ سارا حسن کہاں مر گیا!...
کیسی موت مر گیا!!

سارے گھر والے مزے سے اپنے اپنے کاموں میں
محو ہیں ۔ بھیا اپنے کمرہ میں بیٹھے ستار پر کوئی دھن
چھیڑ رہے ہیں۔

باجی اپنی قوس قزح کے رنگ کی قمیض پر استری کر
رہی ہے وہ ساتھ ساتھ اپنے آپ مسکراتی بھی جاتی
ہے۔ اور استری بھی کرتی جاتی ہے۔

باجی بڑی خوش ہے۔ آج باجی اپنے منگیتر ظفر بھیا کے ساتھ سینما دیکھ
جا رہی ہے۔ دونوں روزانہ جاتے ہیں۔ کبھی سیر کو۔ کبھی سینما۔ کبھی شاپنگ، کبھ
کسی پارٹی پر، کبھی پکنک پر..... دونوں ایک دوسرے سے بے حد پیار کر
ہیں..... دولت نے دولت کو گلے لگایا ہوا ہے۔ ورنہ یہ کبھی پیار نہ کرتے
اگر ظفر بھیا کی ۷۰۰ روپے تنخواہ ہوتی۔ اور کار اور کوٹھی اور بنک بیلنس نہ ہوتا
یہ منگنی کبھی نہ ہو سکتی۔ یہ سینما دیکھنے کبھی نہ جا سکتے..... یہ ایک دوسرے
سے کبھی نہ مل سکتے۔ پھر ایک دوسرے سے ملنے کے لیے انہیں آگ اور خون
سمندر تیرنا پڑتا۔ اور ان کے چہرے زرد ہوتے۔ لیکن ہائے بچارا جلیل! وہ
پر کس قدر مرتا تھا..... لیکن وہ باجی کو کبھی نہ پا سکے گا۔ وہ باجی کی طرف دیکھ
بھی نہیں سکتا..... اس لیے کہ وہ غریب ہے۔

اور غریبی دنیا میں انتہائی خوفناک اور بُری چیز ہے۔

دادی اماں کی ایرانی بلی مزے سے صوفے پر سو رہی ہے اور ہماری لو

نوکرانی دروازے کے پاس فرش پر اونگھ رہی ہے۔ غزالہ اور نیلوفر کے کمرے سے
ریڈیو سیلون کی آواز آرہی ہے۔ ننھا نعمان اور بے بی سلمیٰ بھیا کے کمرہ سے
چرائے ہوئے رسالوں میں سے موٹے موٹے بچوں۔ بلیوں اور طوطوں کی تصویریں
کاٹ رہے ہیں۔ ہر ایک ہنس رہا ہے۔ ہر ایک خوش ہے۔

لیکن مجھے چین اور سکون نہیں ہے۔ میرا دل ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے
پاس بیٹھنے کو نہیں چاہ رہا۔ اور میں گھبرا کر باہر نکل آتی ہوں۔

جب آنکھ میں آنسو ہوں۔ اور دل درد سے بھرا ہوا ہو۔ تو ساری دنیا اداس اور
تاریک نظر آتی ہے۔ اس وقت صرف تنہائی ہوتی ہے اور اچھی لگتی ہے۔ اور تسلی
دیتی ہے۔ اور ہر درد کو سنتی ہے۔

میں چلتے چلتے بڑی مشکل سے چیڑ کے ان گھنے درختوں تلے آ پہنچی ہوں اور
چپ چاپ پاگلوں کی طرح سامنے والی پگڈنڈی کو دیکھ رہی ہوں۔ ساری وادی
تاریک نظر آرہی ہے۔

میری پیاری سہیلی! میری بدنصیب زاہدہ! آج تیری حالت نے مجھے
شعلے کی طرح مضطرب کر دیا ہے۔

اُف لاپرواہ پاگل لڑکی! تو نے کتنی بے دردی سے اپنی زندگی کو جلا ڈالا
ہے۔ اور آج تو اکیلی سینی ٹوریم کی سرد تاریک اور ویران تنہائی میں دم توڑ رہی
ہے۔ مر رہی ہے.....

تو یونہی مر جائے گی۔ یونہی ایک خون ہو جائے گا۔ ایک جان چلی جائے
گی۔ ایک قیمتی اور پیاری زندگی برباد ہو جائے گی۔ اور کسی کو علم نہ ہو گا۔ کوئی جان
نہ سکے گا۔ کچھ نہ ہو گا۔

کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سورج یونہی طلوع و غروب ہوتا رہے گا پھول یونہی
مرجھا کر تازہ ہوتے رہیں گے۔ ہزاروں لڑکیاں محبت کریں گی۔ مگر زاہدہ دوبارہ
واپس نہ آئے گی۔ کچلی ہوئی محبت میں کبھی زندگی پیدا نہ ہو گی۔ شاخ سے ٹوٹا ہوا پھول

اور کمان سے نکلا ہوا تیر کبھی واپس نہیں جائے گا۔

لیکن زاہدہ! آج تیرے چہرہ پر کس قدر سکون ہے۔ ایسا سکون تو بچپن میں بھی کبھی تمہارے چہرہ پر نہیں تھا۔ تو اب کیسے اتنی مطمئن ہو گئی ہے! تیرے ساکت اور منجمد لبوں پر آج زندگی کی کوئی تلخی اور شکایت نہیں ہے۔ تجھے کسی سے کوئی گلا نہیں ہے۔ تیرے ہونٹوں پر دکھ درد کی کوئی سسکی نہیں ہے۔ زندگی ٹھٹھر کر سینے کی قبر میں دفن ہو چکی ہے۔

اور تو سینی ٹوریم کی آندھی تنہائی میں اطمینان سے لیٹی دنیا کو اس راہبہ کی نظر سے دیکھ رہی ہے۔ جو ہر چیز کی حقیقت کو پہنچ چکی ہو۔ تیری پہلی موت سے لے کر اب تک تجھے سکون حاصل نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب تو ایسی آخری موت مر رہی ہے۔ جس کے بعد تجھے کوئی دکھ نہیں ملے گا۔ خوف و سکون ملے گا۔ زندگی نہیں ملے گی۔ صرف موت ملے گی۔ سرد اور سیاہ موت!

اور پھر تم نے زندگی کو کرنا بھی کیا ہے؟ زندگی نے تمہیں دیا ہی کیا ہے جس کے چھن جانے کا تمہیں افسوس ہوگا، تیرے لیے تو موت زندگی کا پیام ہے۔

اف زاہدہ! موت، کا استقبال یوں سکون اور اطمینان سے کرنا۔ یہ نہ جانے کن لوگوں کا حصہ ہے۔ یہ تم جیسے لوگوں کا حصہ ہے۔ یہ بدنصیب دکھی روحوں کا حصہ ہے۔ سچائی کی پرستار روح کا حصہ ہے۔ جن لوگوں کو زندگی دکھوں کے سوا کچھ نہیں دیتی۔ ان کے لیے موت خوشی کا پیغام لاتی ہے جیسے۔ ایک مدت کا بچھڑا ہوا بچہ اچانک اپنی ماں سے جا ملے۔

میری بدنصیب زاہدہ! میری غریب سہیلی! میں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکی۔ . . . میں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکوں گی . . . . اور تمہیں یونہی چپ چاپ مرتے ہوئے دیکھوں گی۔

دیکھ! میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میرا دل پگھل کر میری آنکھوں میں آ رہا ہے۔

اچھی زاہدہ! کیا آج سچ مچ میں نے تمہیں ہی دیکھا تھا! لیکن سچ مچ تم وہی زاہدہ ہو نا۔ جس کی گہری اور شفاف خوبصورت آنکھوں میں زندگی سورج بن کر جھانکا کرتی تھی۔ اور جس کے معصوم بھولے بھالے چہرے پر فرشتوں کی سی پاکیزگی تھی۔

لیکن نہیں۔ وہ زاہدہ آج کہیں نظر نہیں آ رہی۔ آج تو زندگی کی راہ پر کوئی بھٹکی ہوئی دکھی روح نظر آتی ہے۔ جس کے ارد گرد دور دور تک روشنی کا کہیں نام و نشان نہیں۔ صرف اندھیرے کے صحرا پھیلے ہوتے ہیں۔

آؤ اچھی زاہدہ! آؤ ہم اس پیاری لڑکی زاہدہ کو دوبارہ کہیں ڈھونڈیں۔ جسے میں کبھی نہ بھلا سکوں گی۔ اس معصوم اور پیاری زاہدہ کو ڈھونڈیں۔

تب تم ہمارے اسکول میں نئی نئی داخل ہوئی تھیں۔ اور تم سارا دن چپ چاپ اور اداس چہرہ لیے آخری سیٹ پر بیٹھی رہتی تھیں۔ تمہاری کوئی سہیلی نہیں تھی۔ اور تم اپنا بھولا بھالا غمگین چہرہ اوپر اٹھائے سب کو دیکھتی رہتی تھیں یونہی دو تین مہینے گزر گئے۔ اور جب امتحان ہوا تم فرسٹ آگئیں۔ تو ہر لڑکی نے تمہیں چونک کر دیکھا۔ تو پھر بہت سی لڑکیاں تمہارے قریب آگئیں۔ اور تم میں دلچسپی لینے لگیں۔ انہی میں ایک میں بھی تھی۔ استانیاں تمہاری بہت تعریف کیا کرتی تھیں۔

اور پھر آہستہ آہستہ اسی طرح میں تمہارے بہت قریب آتی گئی۔ مجھے دیکھ کر تمہارا اداس سا چہرہ کھل اٹھتا تھا۔ جیسے موتیے کے پھول کو چاندنی میں نہلا دیا گیا ہو۔

ایک روز کلاس میں ٹسٹ تھا۔ اور تمہارے پاس نہ پنسل تھی اور نہ پن۔ اور تم پریشان سی ہو گئی تھیں۔ کسی سے مانگنے کی تم میں جرأت نہیں تھی۔ اور تم نے سب کو ایک نظر سے دیکھا۔ اور میری طرف دیکھ کر تمہیں نہ جانے کیوں جیسے کچھ سہارا ہو گیا اور میں نے ڈھک سے دوسرا پن نکال کر اسی وقت تمہیں دے دیا۔ پہلے تم لینے سے ہچکچائیں اور مجھے انتہائی احسان مند نظروں سے دیکھا۔ لیکن پھر تم نے جلدی سے

پین لے کر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

حالانکہ مجھے تم سے ہمیشہ گلہ رہا۔ مگر تم نے اس مہربانی کو کبھی فراموش نہیں کیا۔

تم ایک چھوٹے سے مکان میں اپنے ظالم دادا۔ بوڑھی والدہ اور ایک چھوٹے بھائی اور ایک چھوٹی بہن کے ساتھ شہر کے تنگ و تاریک محلّے میں رہا کرتی تھیں تم سے اپنی بوڑھی ماں کو محنت و مشقت کرتے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ جو ۳۵ سال کی عمر میں ہی سفید بالوں والا سر لیے ۶۰ سال کی بوڑھی عورت معلوم ہوتی تھی۔ تمہارا دادا بڑا ظالم شخص تھا۔ جو تمہاری پڑھائی کے سراسر خلاف تھا۔ مگر تم کسی نہ کسی طرح پڑھ رہی تھیں تم بہت جلد پڑھ لکھ کر استانی بن جانا چاہتی تھیں۔ اور پھر تمہارا خیال تھا کہ تم اپنے چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن کو بہت اعلیٰ تعلیم دلاؤ گی۔ اور یوں تم لوگوں کے اچھے دن آ جائیں گے۔ اور تم لوگ آسودہ اور خوشحال زندگی گزار سکو گی۔ اور تمہاری یہ بہت بڑی خواہش تھی کہ اس کے بعد تم ساری دنیا کے سفر کو جاؤ گی۔ تم مجھے بتایا کرتی تھیں تمہیں دنیا کو دیکھنے کا بے حد ارمان ہے۔ اور تم اس وقت تک کبھی نہیں مرو گی۔ جب تک کہ تم ساری دنیا کو نہ دیکھ لو گی۔ تم نے اپنے پاس کچھ خوب صورت سینریاں رکھی ہوئی تھیں۔ جو تمہارا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ اس میں ایک تصویر دریائے نیل کی تھی۔ اور تمہیں مصر جا کر دریائے نیل دیکھنے کی کس قدر آرزو تھی! . . . . یہ کوئی تم سے پوچھے اور میں تمہیں ہمیشہ یقین دلایا کرتی تھی۔ کہ ہم دونوں اکٹھی جائیں گی۔

مگر تم ہمیشہ یہ سارا کچھ کہہ کر اداس ہو جایا کرتیں۔ تمہیں پتہ تھا کہ یہ صرف خواب ہی ہے۔ کہاں بمشکل تمام دو وقت کی روٹی اور کہاں دریائے نیل کی سیر۔ لیکن میں اس، خواہش کا ہمیشہ احترام کیا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی۔ کہ میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی میرے ڈیڈی نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ مجھے سمندر پار کے تمام شہر دکھائیں گے۔ اور تم چپ ہو جایا کرتیں۔

اچھی زاہدہ! تم نے تو ابھی ساری دنیا کی سیر کرنی تھی۔ اور سارے خاندان کو اعلیٰ

تعلیم دلانی تھی۔ مگر یہ چار سالوں میں ہی کایا کیسے پلٹ گئی۔

آج نہ تمہاری والدہ زندہ ہے۔ نہ دادا۔ اور تمہارا چھوٹا بھائی اور تمہاری پیاری بہن جسے تم نے لیڈی ڈاکٹر بنانا تھا۔ وہ رشتے کی ایک خالہ کے ہاں رہتے ہیں۔ جہاں سارا دن گھر کا کام کرتے رہتے ہیں۔ تب کہیں جا کر ان کو روٹی ملتی ہے۔

زاہدہ! کیا تمہیں ان کا بھی کوئی خیال نہیں!!

تمہاری زندگی میں ایسا کون ظالم اور بے رحم شخص داخل ہوا جس نے آنِ واحد میں زرخیز کونپلوں کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ ایسی کونسی آندھی چلی۔ جس نے سارے چمن کو اجاڑ کر رکھ دیا۔

تمہاری زندگی کا سورج وقت سے بہت پہلے کیوں ڈوب گیا؟ صبح سویرے یہ کیسی کالی رات ہے۔ جو تمہارے چاروں طرف پھیل گئی ہے۔ پھیل رہی ہے . . . اور تمہیں نگل رہی ہے۔

ان سالوں میں تمہاری دنیا بسی بھی اور اجڑی بھی۔

اور زاہدہ! میں نے تمہیں اپنی دوست کہا۔ اپنی بہن کہا۔ اپنی سہیلی کہا۔ اور پھر تمہاری کوئی خبر نہ لی۔ کوئی حال نہ پوچھا۔ میں ان ۴ سالوں میں تم سے بہت دور ہو گئی تھی۔

کاش! میں دور نہ جاتی . . . . تو تمہاری دنیا کو اجڑنے سے ضرور بچا لیتی۔ کچھ تو کرتی۔

آج میں اپنا پشیمان چہرہ لیے یہاں بیٹھی ہوں . . . . .

وقت گزر رہا ہے . . . . اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے میرا دل ویران سے ویران تر ہوتا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں گھر والے مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ اور میں یہاں اتنی دور اتنی اونچی چوٹی پر کب سے تنہا بیٹھی ہوں۔

یہاں کتنی بلندی اور رفعت ہے۔ اگر یہاں سے کوئی گرے تو اس کی ہڈی پسلی

سُرمہ ہو جائے . . . . ۔ تُو بھی پتہ نہیں کس بلندی سے گری ہے ! کہاں سے
گری ہے ۔

تجھے گرانے والا کون ہے ؟ کہاں ہے ! . . . .

اس نے تجھ سے کیسا بدلہ لیا ہے ؟ . . . . .

تو نے اس کا کیا بگاڑا تھا ؟ ؟ . . . .

وہ مجھے مِل جائے . . . . ۔ پھر دیکھنا کہ میں اس کا کیا حال نہیں کرتی ۔
تمہارے کسی کام نہیں آسکی ۔

زاہدہ ! مگر اتنا وعدہ کرتی ہوں کہ اگر وہ مجھے اس زندگی میں کہیں مل گیا ۔ تو تیرے
سارے بدلے چکا دوں گی ۔ ضرور چکا دُوں گی ۔ مجھے اب کوٹھی واپس چلنا چاہیئے ۔

آج بہت دنوں کے بعد آنکھ کھولی ہے ۔ مسلسل پندرہ روز تک بخار آتا
رہا ۔ کمزوری کتنی زیادہ ہو گئی ہے ۔ بڑی مشکل سے بیٹھی ہوں ۔ جس دن سے
زاہدہ کی موت کی خبر سنی ہے اور اس کا خط پڑھا ہے جو معہ ایک بنڈل کے
لاتھا اس دن کے بعد سے پھر ہوش نہیں رہی ۔ آج دل کچھ آرام اور سکون سے ہے
اور بخار بھی نہیں ہے ۔

سارے گھر والے پریشان تھے ۔ ڈیڈی کو باہر دورے پہ جانا تھا ۔ مگر
میری وجہ سے وہ بھی نہیں گئے ۔ وہ انتہائی طور پہ فکر مند تھے ۔

امی سارا وقت میرے پاس بیٹھی رہتی تھیں ۔ باجی اور ظفر بھیا دونوں چُپ چُپ
سے ہو گئے تھے ۔ ان کے پروگرام بنے کے بنے رہ گئے تھے ۔

ان سب گھر والوں کو میرے لیے گھر والوں کو میرا کس قدر خیال ہے اپنی بیٹی
سے کتنا پیار ہے ۔

مگر زاہدہ تیرا خیال کرنے والا ! اس بھری دنیا میں کوئی نہیں تھا ۔ کوئی نہیں تھا
تو اکیلی مر گئی ۔ مرتے وقت بھی تیرے پاس کوئی نہیں تھا ۔ پتہ نہیں تو ایسے لمحوں میں

کیا سوچتی ہوگی! تیری سوچیں دہکتا ہوا انگارہ ہوں گی۔ جنہوں نے تمہیں جلا کر را
ڈالا۔

زاہدہ! تیرا خط اور خط کے ساتھ یہ چھوٹا سا بنڈل میرے سامنے
پڑا ہے۔ تیرا خط پڑھتی ہوں تو بنڈل کو کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتی
نے لکھا ہے :۔

پیاری نجمہ! پرسوں تمہیں دیکھا۔ ایک طویل مدت کے بعد تمہیں
دیکھا۔ تم میری اس آخری خوشی کا کبھی اندازہ نہ لگا سکو گی۔ جو تمہارے
اور پیارے چہرے کو دیکھ کر مجھے حاصل ہوئی۔ زندگی تمہارے لیے کتنی خوبص
اور آسودہ خواب ہے۔ خدا کرے۔ تم ساری زندگی اسی خواب کی چھاؤں ت
سے بسر کر سکو۔

میں مر رہی ہوں۔ اور میری زندگی کے چند سانس باقی رہ گئے ہیں۔
اس دنیا میں کبھی واپس نہ آؤں گی۔ نہ تمہارا پیارا چہرہ دیکھ سکوں گی۔ نہ نیلا آسمان
نہ درخت۔ نہ اپنے چھوٹے بہن بھائی جو یہاں سے بہت دور رشتے کی
پاس بیٹھے اس وقت نہ جانے کیا کر رہے ہوں گے۔ خدا جانے ان کا کیا
. . . خالہ جب میرے سامنے ان کو مارتے سے فرق نہ کرتی تھیں۔ تو ا
کا کیا نہ حال ہوتا ہوگا۔ نجمہ! یہ خیال، یہ سوچ۔ یہ تصور، مجھے شاید قبر
چین سے نہ لیٹنے دے گا۔

کاش! وہ دونوں بھی میرے سامنے مر جاتے تو اچھا تھا۔ کتنا اچھا تھا
ہم لوگوں کے لیے زندگی سے زیادہ اچھی ہوتی۔

مجھ سے زیادہ باتیں نہ ہو سکیں گی نجمہ! کھانسی رکنے کا نام نہیں لے ر
میں تمہیں لکھتی جا رہی ہوں۔ رات ہوتے ہوتے بیت رہی ہے، یوں لگتا ہے
آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔

اے دکھوں سے بھری ہوئی لمبی۔ کالی اور پریشان رات! تیرا دل کس

ے آزاد ہو کر دھڑک رہا ہے۔ ٹھٹھر رہا ہے۔ تو کیوں نہیں خوشی
ے بھاگ کر گزر جاتی! تیرا ایک ایک قدم غم سے بوجھل اور نڈھال کیوں
رہا ہے۔ کیا تیری بھی کوئی بہن اور بھائی تجھ سے کہیں بہت دور بیٹھے
کسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج تو مجھے آخری بار اس بستر پر دیکھ رہی ہے
تو مجھے قبر میں دیکھے گی۔

رات کی سرد ہواؤ! میرا پیار میری بہن نسیمہ
اور میرے بھائی انجم کے لیے لے جاؤ میری امی کی
قبر پہ جا کر بوسہ دو۔

اے آسمان کی پیشانی پہ چمکنے والے ستارو! میری
زندگی ختم ہو رہی ہے۔ مگر تم اسے کبھی نہ بتانا۔ کہ
وہ زاہدہ آج مر گئی۔ جسے تو نے اپنا کہا تھا۔ اور
زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔

میری سہیلی نجمہ! خط کے ساتھ یہ چھوٹا سا بنڈل
بھی تمہیں بھیج رہی ہوں۔ اس میں میرے کچھ خط۔ اس
کے خط۔ میری ڈائریاں۔ کچھ یادیں اور کچھ اداسیاں بھری
ہوئی ہیں۔ تم ان سب کو رکھ لو۔ اور اگر کبھی تمہیں اس
دنیا میں "وہ" کہیں مل جائے۔ تو اسے کبھی نہ بتانا کہ زاہدہ
مر چکی ہے۔ اسے کبھی نہ بتانا کہ زاہدہ تو اسی روز مر
گئی تھی۔ جس دن اس نے اسے چھوڑ کر اپنی پھوپھی
کی لڑکی ثمینہ سے شادی کر لی تھی۔ تم وعدہ کرو کہ تم
کبھی اسے نہیں بتاؤ گی۔ میری ان سب یادوں
کو پڑھنے کے بعد جلا دینا، راکھ کر دینا۔ میں جیتے
جی ان کو راکھ میں تبدیل نہ کر سکی۔ خود راکھ ہو گئی۔ مگر

تم میرے مرنے کے بعد ان کو راکھ میں بدل دینا
تاکہ ہم ایک ہو جائیں ۔
اور نجمہ! میری سہیلی! وعدہ کرو ۔ تم نسیمہ اور
انجم کی زندگی کا میرے بعد ضرور خیال رکھو گی ۔ اب
الوداع میری دوست! الوداع..... الوداع..... الوداع ۔

---

۲۵ ۔ نومبر :-
آج اسکول میں ہم سب لڑکیاں بہت ہنستی رہیں ۔ بہت دنوں کے
ہنسی میرے لبوں تک آئی تھی ۔ مجھے ہنستے ہوئے بڑا ڈر لگا کرتا ہے
اور خوشی ہماری قسمت میں کہاں ہے ۔ لیکن پھر بھی جب منوّر، ثریا
ت اور زرینہ نے لطیفے سنائے، نقلیں اتاریں اور خوب ایکٹنگ
ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا ۔ اور ہنسنے سے کچھ دیر پہلے جو مجھے سردی
رہی تھی وہ دور ہو گئی ۔ یہ تو فائدہ مند ہنسی ثابت ہوئی سردی کتنی زیادہ
ہی ہے ۔ مگر میرے پاس کوئی گرم کپڑا نہیں ہے ۔ صرف ایک سویٹر ہے
ل کے پاس کتنے خوبصورت سویٹر اور کوٹ ہیں ۔ مگر ہمارے پاس کچھ نہیں
۔ آج صبح عشرت مجھے کہہ رہی تھی ۔ زاہدہ! تم گرم چادر لے کر کیوں نہیں
کیا تمہیں سردی نہیں لگتی ۔ اور میں نے ہنستے ہوئے اسے کہا تھا ۔

نہیں ہے کوٹ کی حاجت نہیں ہے
کہ میں حلوے سے گرمائی گئی ہوں

اور وہ ہنس دی تھی ۔ میں بھی ہنس دی تھی ۔ میں تو اب بھی ہنس رہی ہوں ۔

لیکن اس میری ہنسی میں وہ جھنکار اور موسیقی کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اکثر ہنسی کی
آواز سے ڈر ہی لگتا ہے۔ لیکن اور لڑکیاں تو بڑی پیاری آواز سے ہنستی ہیں
تو اپنی ہنسی پر ہمیشہ یہی گمان ہوا ہے کہ جیسے ظالم اور بے رحم مالکہ کے چینی کے
برتن اٹھا کر لے جا رہی تھی۔ کہ چھن سے ٹوٹ گئے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا ہے؟ اور
خوف سے دھڑکنے لگتا ہے۔

آج بھی سارا دن ہنستی رہی۔ تین بجے چھٹی ہوئی اور میں گھر آئی ابھی سیڑھ
ہی میں تھی کہ ادھر سے دادا جان کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ میرا دل دھڑک
ہو گیا۔ ہونٹ خشک ہو گئے اور میں کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ سی
طے کرنے لگیں۔

میرا دل غم کی گہری وادیوں میں ڈوب گیا۔ مجھے افسوس ہونے لگا
کیوں ہنسی۔

میں آدھی سیڑھیاں طے کر کے سانس روک کر کھڑی ہو گئی۔ اور
لگی کہ دادا جان کیا کہہ رہے ہیں۔ دادا جان کہہ رہے تھے۔

میں کہتا ہوں۔ جب وہ اچھا بھلا کماؤ مرد ہے۔ اپنی دکان کرتا
پیسے روز کما کر لے آتا ہے۔ کیا ہوا جو اسے بھنگ اور افیون کا نشہ کر
عادت ہے۔ تو زاہدہ کی بات وہاں پکی کیوں نہیں کرتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں
پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ کب تک انتظار کروں! تو بیٹی کو اسکول بھیج کر ہماری
داغدار کر رہی ہے۔ حرامزادی ! دیکھ میں تجھے کیسے ٹھیک نہیں کرتا
گھر سے نکال باہر کروں گا۔

آج زاہدہ کو آلینے دو۔ جو اس گھر سے اس نے پھر باہر قدم
یار سے ملنے جاتی ہے۔ اسکول کیا جاتی ہوگی۔ بھلا کبھی
کی بہو بیٹیاں بھی گھر سے نکلی ہیں۔ ہم نے کونسی نوکری کرانی ہے!!
اور امی کہہ رہی تھیں:

تو نے جو ظلم مجھ پر کیے ہیں۔ میں نے صبر کے ساتھ
سارے برداشت کیے ہیں۔ میں نے اُف تک نہیں
کی۔ یونہی ساری جوانی تیرے ظلموں تلے کاٹ دی،
مگر اب بیٹی کے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دوں گی۔
میں اس نامراد افیونی کے ساتھ اپنی چاند سی بیٹی کبھی
بیاہنے نہ دوں گی۔ جا، آج میں بھی تجھے صاف کہے
دیتی ہوں۔ آج تیرا لحاظ بھی ختم ہو گیا ہے اب تو میری
بیٹی کے ساتھ ظلم نہیں کر سکتا۔

دادا جان نے یہ سنتے ہی چولہے سے آدھ جلی لکڑی نکالی اور مارنے ہی لگے
کہ میں اوپر چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ لکڑی والدہ کو مارنے کی بجائے میری طرف
کر آئے۔ اور زور سے میری پیٹھ پر مار دی۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ مگر
سے کھڑا نہ ہوا جا سکا میں گر پڑی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمسایوں کی باتیں۔ امی کے
نے کی آوازیں۔ یہ سبھی کچھ دور کنوئیں سے آتا ہوا محسوس ہوا۔ رات گئے تک
دگی سی طاری رہی۔ اور پھر ہوش میں آگئی، میں روتی رہی۔

یا خدا تو نے مجھے کس گھر میں پیدا کر دیا ہے! اگر اس گھر میں پیدا کرنا تھا تو
ر ایسا دل کیوں دیا! دل کے اندر ایسی آرزوئیں کیوں پیدا کر دیں! علم سے
محبت کیوں دے دی؟ یہ کتنا ظالم دادا ہے بوڑھا ہو گیا ہے، مگر
بھی نہیں۔ کتنے عرصے سے ظلم کر رہا ہے! اوروں کے گھر میں یہ ظلم
نہیں ہوتا۔ ہمارے گھر میں کیوں ہوتا ہے؟ ہم نے کونسا گناہ کیا ہے؟
لوگ کیوں سزا مل رہی ہے؟ یہ ظلم کیوں ہوا؟ اسے نہیں ہونا چاہیے۔ میں
کرنے والے کو خود مٹا دوں گی۔ ہمیں بھی دنیا میں خوش رہنے کا حق حاصل
۔ میں کل ہی امی سے کہوں گی۔ ہم اس گھر کو چھوڑ کر کہیں اور چل دیتے ہیں۔
یہ دادا نہ ہو۔ اور لڑکیاں کتنی خوش رہتی ہیں۔ ان کے والدین ان کو پڑھنے

سے کبھی منع نہیں کرتے ۔

کل میں آسیہ کے گھر اس کی کتاب پڑھنے کے لیے لینے گئی [تو]

کا گھر کتنا بڑا ہے ؟ کتنا خوبصورت سجا ہوا ہے ۔

کاش ! ہمارا بھی ایسا گھر ہوتا ! اس کی امی نے کتنے اچھے کپڑے پہ[نے]
تھے ۔ نوکر کام کر رہے تھے ۔ اور پھر نچلے کمرہ میں جب میں آسیہ کا
سمجھ کر اندر چلی گئی ۔ اور صوفہ پر ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئی تھی ۔ اور پھر بیں
کی تصویریں دیکھنے میں اس قدر محو ہوگئی کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا ۔ کب اس کا
کر سامنے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے اور مجھے گہری نظروں سے تک رہا ۔
جب میں نے اس کو دیکھا تو چیخ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئی ۔ اور م
گئی اور میرا حلق خشک ہوگیا ۔ اور میں اٹھ کر بھاگنے لگی تھی ۔ کہ اس نے
سے پکڑ کر بٹھا لیا ۔

آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئیں ۔ واقعی یہ میری زیادتی تھی ۔ آپ مت
بیں خود چلا جاتا ہوں ۔ صرف اس سگریٹ کو ختم کرنے تک یہاں بیٹھوں گا
شوق سے تصویریں دیکھیں اور اگر آپ کو تصویروں کا شوق ہے ۔ تو
لائے دیتا ہوں ۔ ادھر الماری میں بہت سی پڑی ہیں ۔

آپ خود ہی اٹھ کر نکال لیں ۔ یہ آپ کے پچھلی طرف جو الماری ہے
نکال لیں وہاں سے ۔

ارے ! آپ تو خواہ مخواہ اتنا زیادہ شرما رہی ہیں ۔ اس میں بھلا
کی کیا بات ہے ! اور پھر آپ کا ہاتھ بھی کس قدر ٹھنڈا ہو رہا ہے ۔
اچھا ! آپ تو بول ہی نہیں رہیں ۔ میں خود ہی نکال دیتا ہوں ۔

. . . . . . یہ سویٹزرلینڈ کی تصویر ہے . . . . . .

اور یہ . . . . .

آپ کو پسند ہیں ! آپ لینا چاہیں تو لے سکتی ہیں ۔ آسیہ نے بتایا تھا ۔
کہ آپ کو ایسی تصویروں کا بہت شوق ہے ۔ اور خوش قسمتی کہیئے یا بدقسمتی سمجھے
بھی بہت شوق ہے ۔ لیکن آسیہ کو ذرا سا بھی لگاؤ نہیں ۔

لیکن آپ کتنی چپ بیٹھی ہیں ۔ کوئی تو بات کریں ۔ میں اس وقت سے خود ہی
ل رہا ہوں ۔

لیکن میں تو گونگی ہو گئی تھی . . . . . . ایک لفظ تک نہیں بولا
رہا تھا ۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گیا ۔

تھوڑی دیر کے بعد آسیہ آگئی ۔ اور ساتھ نوکر چائے لے کر آیا ۔
اس کا بھائی بھی زبردستی چائے میں شریک ہو گیا ۔

کتنی باتیں کرتا تھا اس کا بھائی ! کتنا ہنس مکھ اور کتنا خوبصورت سا
ہے ۔ اس کی آنکھیں کس قدر چمک دار تھیں ۔ اور جسم کتنا اچھا تھا . . . .
لیکن وہ اتنی دلچسپی سے کیوں باتیں کر رہا تھا . . . . . .
اور پھر دوبارہ آنے کا کتنا اصرار کر رہا تھا ۔ آج آسیہ نے بھی کہا تھا
کہ تمہارے جانے کے بعد میرے بھائی نے تمہاری بہت تعریف کی
تھی ۔ کتنا تھا بڑی بھولی اور معصوم اور پیاری سی لڑکی ہے ۔ اور میں خواہ
مخواہ شرما گئی تھی ۔

ہائے ! اگر دادا جان کو پتہ چل جائے کہ میں نے ایک مرد کے
ساتھ بیٹھ کر چائے پی ہے۔ تو وہ ابھی بمعہ والدہ اور بہن بھائی کے ہم
کند چھری سے ذبح کر دے۔ اور خود پاگل ہو جائے۔ اس کے خیال
دنیا میں قیامت آجائے۔ کیونکہ دادا جان قیامت کی نشانیاں یہی بتا
ہیں۔ اور دوزخی ہونے کی بھی۔ جب کوئی لڑکی کسی غیر لڑکے کے
ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے گی۔ چاہے وہ باتیں قرآن مجید اور نماز کی کیو
نہ ہوں؟ تب قیامت آجائے گی۔

لیکن قیامت تو کوئی نہیں آئی۔ نہ آئے گی۔ دادا جان کا تو دماغ خرا
ہے۔ ہائے پیٹ پر کتنا درد ہو رہا ہے۔ امی سینک کرتی رہی تھیں۔ دو تین
یک اسکول نہ جاسکوں گی۔ اچھا میں گھر میں بیٹھ کر کام کروں گی۔

دیکھیں دادا جان کیا قیامت کھڑی کرتے ہیں۔

اب تو امی بھی کہتی ہیں کہ اسکول جانا چھوڑ دے۔ کیا فائدہ! تجھے یہ
کر دے گا۔

ہائے امی! یوں نہ کہو . . . . میں پڑھنا کبھی نہ چھوڑوں گی
کے لیے اپنی بیٹی کا دل نہ توڑو۔ یہ دادا تو پاگل ہے۔

---

۲۹ رنومبر :-

آج کئی روز کے بعد اسکول گئی۔ اداس غمگین ہو کر دل پریشان سا رہتا ہے۔
جان جانے نہیں دیتے تھے۔ بڑی مشکل سے ان کی خوشامدیں اور منتیں کر کے گئی تھی ک
جماعت کو پاس کر لوں۔ یہ آخری جماعت ہے۔ پھر دسویں پاس کر لوں گی۔ پھر آگے
بیٹھوں گی . . . . تب کہیں جا کر وہ مانے۔ آسیہ اسکول نہیں آئی تھی۔ میں نے کتاب
کرنی تھی۔ چھٹی کے بعد اس کے گھر گئی تو پتہ چلا کہ وہ شاپنگ کے لیے بازار گئی ہوئی
بس اب آنے ہی والی ہو گی۔ مجھے بیٹھ کر اس کا انتظار کر لینا چاہیے۔ نوکر نے نچلے کمر

کھول دیا اور میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر گزری تو مجھے اچانک خیال آیا کہ اگر اسکا بھائی آگیا تو؟ اور
میرا دل دھڑکنا شروع ہو گیا۔ میں نے سوچا کل اسکول میں کتاب واپس کر دوں گی۔ مجھے چلے ہی جانا
چاہیے اور میں اٹھ کر آنے لگی۔ سیڑھیاں طے کر رہی تھی کہ آسیہ بمعہ اپنے بھائی کے بازار سے واپس
آگئی۔

ہلو! زاہدہ! تم کب آئیں؟

ابھی ابھی آئی تھی . . . . . . بس اب جانے لگی تھی۔ میں نے رک رک کر کہا۔

تو تم کچھ دیر بھی انتظار نہ کر سکیں۔ بس یہی ہماری قدر ہے! آسیہ نے منہ بنا کر کہا۔

نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ کہیں زیادہ دیر نہ ہو جائے۔ کل آجاؤں گی۔

اس کے بعد ہم تینوں اندر کمرہ میں جا بیٹھے۔ اور پھر جو باتیں شروع ہوئیں تو گھنٹہ ہو گیا۔ سردیوں
کے دن بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو شام پھیل رہی تھی۔ میرا دل بڑا ڈرا کہ دادا جان
تو جان ہی نکال دیں گے۔

میں بڑی مشکل سے آسیہ سے رخصت لے کر آئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف چلنے لگی۔ دادا
جان گھر پر نہیں تھے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

رات کو مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ آسیہ کا بھائی یاد آتا رہا اس کو سرخ ٹائی کتنی اچھی لگ رہی
تھی۔ اور فاختائی رنگ کا گرم سوٹ اسے کتنا سج رہا تھا . . . . اس کے چہرے پر کس قدر دلکشی
ہے!

اور یہی سوچتی ہوئی سو گئی۔

۱۵۔ دسمبر :-

امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ نو ماہی امتحان ہو رہے ہیں۔ آسیہ نے کئی
بار بلایا ہے۔ مگر میں جا ہی نہیں سکی۔ کل تو آسیہ خفا ہی ہو گئی۔ کہ تم کیوں نہیں آئیں۔ نجمہ کوئی
دو مہینے سے اسکول نہیں آرہی۔ نجمہ میری بہت پیاری دوست ہے۔ کتنی مہربان اور مخلص

لڑکی ہے۔ دسویں کلاس کے بعد مجھ سے جدا ہو جائے گی۔ اس کے ابا جان کی تبدیلی کولمبو ہو گئی ہے۔ یہ وہاں چلی جائے گی پھر نہ جانے کب آئے گی۔

آسیہ اور قسم کی لڑکی ہے۔ اس سے میری طبیعت نہیں ملتی۔ مگر نجمہ تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ مجھے برابر خط لکھے گی۔ ننھے انجم کو بھی نجمہ کس قدر پیار کرتی ہے!..... میرا ننھا بھیا انجم اداس ہو جائے گا۔ اور نسیمہ بھی۔

کاش! میں بھی نجمہ کے ساتھ کولمبو جا سکتی۔ سیلون کس قدر خوبصورت شہر ہو گا؟ وہاں ناریل کے درخت ہیں۔ تیز بارشیں ہیں۔ کنول کے پھول ہیں۔ جھیلیں ہیں۔ مندر ہیں.... آسیہ کے بھائی نے بتایا تھا کہ سیلون میں سڑک پر گندگی کے ڈھیر کی جگہ بھی پھولوں کے ڈھیر ہوتے ہیں... ہائے! وہ شہر کس قدر خوبصورت ہو گا۔

۲۶- دسمبر:-

آسیہ دسمبر کی چھٹیوں میں کراچی سیر کے لیے گئی ہوئی ہے۔ مجھے اس نے بتایا ہی نہیں۔ میں اس کے ہاں گئی۔ تو پتہ چلا کہ سارے چلے گئے ہیں۔ اس کا بھائی اختر یہیں موجود تھا۔ میں نے واپس آنا چاہا تو اس نے بٹھا لیا.... میں گھبرا گئی۔ میں ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔ اکیلے گھر میں۔ اگرچہ نوکر بھی تھے۔ مگر پھر بھی مجھے ڈر تھا کہ آسیہ کیا کہے گی؟

لیکن اس نے زبردستی بٹھا لیا۔ نوکر کو چائے لانے کو کہہ دیا۔ میں بہتیرا منع کرتی رہی۔ مگر نہ مانا.... پھر اس نے مجھے کشمیر کی تصویریں دکھائیں۔ کشمیر اور کلو کی چراگاہیں۔ وہاں کے نظارے اور بتایا کہ ساری تصویریں میں نے خود کیمرے سے لے کر رنگ بھرے ہیں.... اس نے کشمیر کا کونہ کونہ دیکھا ہوا ہے۔ وہاں اتنے خوبصورت پہاڑ ہیں۔ پھول ہیں۔ درخت

ہیں۔ چوٹیاں ہیں۔ ٹھنڈی ہوائیں ہیں۔ کہ تم دیکھو، تو پاگل ہو جاؤ۔

مجھے سیر و سیاحت کا بہت شوق ہے۔ اور میں ساری دنیا کا چکر لگانا چاہتا ہوں۔ پچھلے سال میں انگلینڈ چھ ماہ رہ کر آیا ہوں۔

تمہیں وہاں کی باتیں کیا بتاؤں!..... کس قدر آزاد اور خوشحال اور خوبصورت ملک ہیں ہم لوگ تو ان کے مقابلے میں صفر کے برابر بھی نہیں ہیں۔ وہاں عورتیں آزاد پھرتی ہیں۔ ان کی صحتیں اس قدر اچھی ہیں کہ گلاب کے پھول معلوم ہوتی ہیں.... مگر.... اور پھر جھجک کر وہ کہنے لگا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے تم سے زیادہ بھولی اور شرمیلی نہیں ہیں۔

اچھا دیکھو زاہدہ! ایک بات کہوں۔ برا تو نہ مانو گی۔ لیکن اگر تم برا بھی مناؤ گی تو بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تم کو بہت پیار کرنے لگا ہوں۔ اور زاہدہ! تم مجھے بہت یاد آنے لگی ہو۔ جس دن سے تمہیں دیکھا ہے بہت اداس رہنے لگا ہوں۔

کیا تم اس گھر میں رہنا پسند کرو گی....

کیا تم آسیہ کی بھابی بنو گی!!

کیا تم میری بنو گی!!!

میں ایسی محبت نہیں چاہتا۔ جو صرف محبت ہو۔ بلکہ میں تو تم سے شادی کر کے اپنی بیوی بنا کر گھر لانا چاہتا ہوں۔ اور ساری عمر اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔

بولو! کیا تم میری بیوی بنو گی!

ہائے! میں اس کی باتوں کا بھلا کیا جواب دیتی۔ میں شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی مجھ سے تو آنکھ تک نہیں اٹھائی جاتی تھی۔ بولنا تو الگ رہا۔

آسیہ کا خوبصورت۔ نوجوان اور دلکش چہرے والا بھائی۔ اختر میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اور مجھے تکے جا رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تو وہ پرفسوں نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ میں سر سے لے کر پاؤں تک لرز گئی.... میرا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔

وہ بولا.... بتاؤ زاہدہ! کچھ تو بولو.... کیا تم مجھے پسند نہیں کرتیں۔

لیکن میں خاموش رہی ۔ میں اسے کیا بتاتی ! میں اسے کیا جواب دیتی !
بھلا دھرتی کے باسی پھول اور آسمان کے چمکتے ہوئے ستارے کا بھی کبھی ساتھ ہُوا ہے ۔ بھلا مخمل اور ململ کا بھی کبھی میل ہُوا ہے !! کہاں محلوں میں رہنے والا اختر . . . اور کہاں جھونپڑی میں رہنے والی زاہدہ ! کشادہ باغوں اور تنگ گلیوں کا کیا میل ! میرا دل ایکدم اس کی محبت سے بھر آیا ! اپنی غریبی پر بھر آیا ۔ اس آغاز کے انجام پر رونے لگا . . . . . اور آخر میں دادا جان کا چہرہ یاد آتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ اور یہ رونا اس وقت اور تیز ہو گیا جب مجھے کریم افیونی اور بھنگی کا خیال آیا ۔ جس کے ساتھ میرا دادا مجھے باندھنا چاہتا تھا اختر میرے رونے پر حیران رہ گیا ۔ اس نے سمجھا کہ شاید اس کی باتیں مجھے بُری لگی ہیں ۔ بے چارہ گھبرا گیا ۔ کہنے لگا ۔

زاہدہ ! خدا کے لیے مت روؤ ! مجھے بتاؤ رونے کی وجہ کیا ہے ؟ کیا میری کسی بات پر تمہیں رونا آیا ہے ! میری باتیں تمہیں بُری لگی ہیں ! . . . . کیا تم اس رشتہ کو پسند نہیں کرتیں اگر تم نہ چاہو گی تو میں زبردستی نہیں کروں گا ۔ مگر خدا کے لیے روؤ نہیں ۔ دیکھو ابھی نوکر چائے لے کر آ جائے گا ۔ تو وہ دیکھے گا تو کیا کہے گا . . . . چپ ہو جاؤ . . . . یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ۔ اور اسے چوم لیا ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں ۔ میں نے جلدی سے ہاتھ چھڑایا اور پھر بغیر بات کئے چائے پیئے گھر آ گئی ۔ اس نے کتنا زیادہ اصرار کیا ۔ مگر میں نہ ٹھہری ہائے ! میں کتنی پاگل ہو گئی تھی . . . . . میں نے اس کی بات کا کوئی جواب ہی نہ دیا ! کیا پتہ میری قسمت کتنی اچھی ہی ہو ۔ اگر میری شادی وہاں ہو جائے تو ! . . . . سب ہمسائیوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں ۔ میری سہیلیاں حیران رہ جائیں ۔ میری والدہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی کتنی ہی جھریاں ٹھیک ہو جائیں ۔ ہائے اللہ ! ہمارے کتنے دن نہ پھر جائیں ! میرا چھوٹا بھائی اور بہن ایسا بھائی پا کر کس قدر خوش نہ ہوں لیکن ہمارا گھر تو کس قدر چھوٹا سا ہے ۔ کیا وہ یہاں آ جایا کرے گا ! کیا اس کے گھر والے مان جائیں گے ۔

نہیں وہ نہیں مانیں گے ۔ وہ کیسے مانیں گے کہ انکا اکلوتا بیٹا اور بھائی ایک غریب لڑکی سے شادی کرے ! . . . . کبھی نہیں مانیں گے ۔

میں بھی بھلا کتنی پاگل ہوں ۔ جو ایک دم سوچنے پر اتر آئی ہوں کیا معلوم اس نے مذاق ں کیا ہو . . . . .
میں تو سچ مچ پگلی ہوں ۔
اب میں ایسا کبھی نہ سوچوں گی ۔ میں اس کے گھر ہی نہیں جاؤں گی ۔ کبھی نہیں جاؤں گی ۔ کہیں دادا ں کو پتہ چل گیا تو وہ گلا ہی دبا دیں گے ۔
یا خدا ! میری مدد کرنا ۔ مجھے وہاں جانے سے روکنا ! آمین ثم آمین ! اے میری نیند ! تو اب دی سے میرے پاس آ جا ۔ میں اب سونے جا رہی ہوں ۔ امی کہہ رہی ہیں کہ اتنی رات گئے تک ی کے دیئے تلے بیٹھ کر اسکول کا کام مت کر آنکھیں خراب ہو جائیں گی ان کو کیا پتہ کہ آنکھوں کے ساتھ یہاں دل بھی خراب ہو رہا ہے ۔
یا خدا ! میری مدد کرنا ۔ مجھے بُری راہ سے بچانا ۔ میری سہیلیاں کہتی ہیں ۔ کہ مرد بے وفا ہوتے ہیں ۔ لڑکی کو خراب کر کے چھوڑ جاتے ہیں ۔ بدنام کر دیتے ہیں ۔ یا خدا ! مجھے ان سے بچانا ۔ ضرور بچانا آمین ۔

۲۔ جنوری

آج سے اسکول کھل گیا ہے۔ صبح سویرے اسکول گئی۔ دعا ہوئی۔ دعا کے بع
میں آ گئی۔ آسیہ ملی۔ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میرا دل ایک دم دھڑکنے لگا۔ می
آنکھیں نیچی کر لیں جیسے چوری کرتے پکڑے گئی ہوں۔ وہ ہنسنے لگی۔ اور پھر مجھے ایک
جا کر ایک رقعہ دیا۔ کہ یہ لو، اسے آدھی چھٹی کے وقت پڑھ لینا! ابھی ڈسک میں بند کر
لو۔ میں نے بغیر جواب دیئے جلدی سے لے لیا۔ اور ڈسک میں بند کر لیا۔ کہیں لڑکیا
لیں۔۔۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پہلے ہی اس چیز کی منتظر تھی۔ آدھی چھٹی کے وقت
کی ہمت نہ ہوئی لیکن سارا وقت بے چین سی رہی۔ بار بار تالے کو دیکھتی رہی کہ کبھی
کیا لکھا ہے! کیا لکھا ہوگا؟ پتہ نہیں کیا ہوگا؟ کہاں جا کر دیکھوں؟
اچھا لیٹرین میں جا کر دیکھتی ہوں اور پھر میں اُدھر چلی آئی۔ اور لیٹرین میں جا کر خط
پڑھا! لکھا تھا:۔
پہلی دفعہ کچھ سمجھ نہ آئی۔ دوسری بار پھر پڑھا۔

"پیاری زاہدہ!
تمہیں بہت بہت پیار!
تم اس دن سے برابر یاد آ رہی ہو۔ میں روزانہ گھر پر تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں۔ مگر تم نہیں آئیں اگر تمہیں میری اس دن کی باتوں کا بُرا لگا ہو۔ تو مجھے معاف کر دو۔ لیکن میں کیا کروں! میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ اور اب بھی تمہیں وہی باتیں دہرا کر تم سے جواب مانگتا ہوں۔ امید ہے تم ضرور جواب دو گی۔۔۔۔
کیا تم آج اسکول کے بعد آؤ گی!
میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا:۔ فقط

صرف تمہارا
اختر"

خط پڑھ کر میں نے جلدی سے پھاڑ دیا۔ اور ٹکڑے وہیں پھینک کر آ گئی۔ باہر نکلی تو یوں لگا اندر داخل ہوتے وقت جو مال گاڑی سر پر کھڑی تھی۔ وہ اب گزر چکی ہے اور میں ہلکی ہو کر نیچے آ گئی ہوں۔
میں خاموشی سے سیڑھیاں طے کر کے نیچے آ گئی۔ مجھے ایک دم یوں محسوس ہوا تھا جیسے اختر اور آسیہ مل کر مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ بھلا اختر کو مجھ سے ایسی کونسی محبت ہو سکتی ہے۔۔۔۔ لیکن میں بے وقوف نہیں بنوں گی۔۔۔ میں کبھی نہیں جاؤں گی ساری
چھٹی کے وقت آسیہ نے مجھ سے پوچھا۔ زاہدہ آج ہمارے گھر آؤ گی۔
نہیں میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ میں نہ آ سکوں گی۔!
اور وہ چلی گئی۔ میں اپنے گھر آئی اور اداس اور خاموش سی ہو کر اپنی کھڑکی میں بیٹھ گئی۔ سامنے کے مکان میں ایک لڑکا اظہر رہتا ہے اس کی نئی شادی ہوئی ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ادھر دھوپ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور بیوی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی ہے اور وہ محبت اور پیار سے بھری ہوئی نظروں سے اسے تک رہا ہے۔۔۔۔ اور وہ مسکرا رہی ہے۔
مجھے ایک دم یوں لگا جیسے اظہر کی جگہ اختر ہے اور اس کی بیوی کی جگہ میں ہوں۔ اور دنیا

بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ جہاں قدم قدم پر ایسا پیار کرنے والے خاوند کی مسکراہٹ اور
پُرمحبت نظریں میسر ہیں۔ مگر داداجان کی آواز نے میری تصویر کو دھندلا کر دیا اور میں ان کے
پاس جا پہنچی۔

کیا بات ہے داداجان!

بیٹی! ذرا میرے حقے میں دو کوئلے تو چولہے سے لا ڈال! اور دیکھ! ادھر طاق پر
کی پڑیا پڑی ہے اسے بھی لیتی آ، اور دیکھ، انیسہ اور انجم باہر گلی میں نکلے تھے۔ آدھ گھنٹہ
گیا ہے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے۔ ان کو ذرا آواز دے۔

میں نے خاموشی سے سارے کام کر دیئے۔ اور پھر کھڑکی کے پاس آ بیٹھی۔ مگر ان
دونوں نیچے چلے گئے تھے، اور مجھے یوں لگا جیسے وہ نیچے نہیں گئے بلکہ آسیہ کے گھر
ہیں۔

۲۶۔ جنوری:۔

کئی روز سے اداس اور خاموش ہوں۔ آسیہ سے کتراتی ہوں۔ حالانکہ اس نے
گھر آنے کے لیئے کئی بار کہا ہے۔ مگر میں نہیں جاؤں گی۔ میں کیوں جاؤں!!...

میری زندگی ایک ایسا اداس گیت ہے۔ جیسے امتحانوں میں ایک ماہ رہ گیا
ہے۔ اب مجھے پورے دھیان سے پڑھنا چاہیئے۔ پہلی مارچ کو امتحان شروع ہو رہے
خدا کرے..... میں میٹرک میں وظیفہ لے لوں۔ اس کے بعد میں ایف۔ اے
کروں گی۔ پھر بی۔ اے۔ اور پھر ایم۔ اے اور پھر انگلینڈ چلی جاؤں گی...

ہائے! کتنا اچھا ہو جو ایسا ہو جائے!

کاش ایسا ہو جائے! آمین۔

۴۔ فروری:۔

آج آسیہ نے بتایا کہ اس نے ایسے گیس پیپرز منگائے ہیں جس میں سے پورے کے
پورے سوال آجائیں گے۔ اور وہ کہنے لگی کہ وہ مجھے بھی ضرور دے گی۔

آسیہ کتنی اچھی لڑکی ہے۔ اس نے کلاس میں کسی اور لڑکی کو نہیں بتایا۔ صرف مجھے
بتایا ہے۔ میں خواہ مخواہ اس سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔

اس کے بھائی نے بڑی مشکل سے یونیورسٹی کے کسی شخص سے حاصل کیئے ہیں۔
اور اب وہ مجھے ضرور دے گی۔ وہ سکول نہیں لا سکتی نا کیونکہ اگر یہ بات OUT ہو گئی
تو پھر اس شخص کے لیئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ اور پھر پرچے نئے سرے
بنوانے پڑیں گے۔

میں کل لینے کے لیے اس کے گھر جاؤں گی۔ آج میرے کپڑے کچھ اچھے نہیں
۔ کل جاؤں گی۔

۵۔ فروری:۔

آج میں آسیہ کے ہاں گئی۔ اس کا بھائی کمبل اوڑھے پلنگ پر سویا ہوا تھا۔ ہم
دوسرے کمرہ میں چلی گئیں۔ آسیہ کہنے لگی۔ پرچے بھیا کی الماری میں ہیں۔ ابھی اٹھیں گے تو دیں

اس کے بعد ہم اور باتیں کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اختر اٹھا۔ آنکھیں نیند سے
لال ہو رہی تھیں۔ چہرے پر عجیب طرح کا سحر تھا۔ مجھے دیکھا تو بے حد خوش ہوا۔ اور جلدی
میرا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ اور پھر زور سے ہاتھ دبا لیا۔ میں شرم سے پاگل سی ہو گئی۔
کتنا پاگل ہے اس کا بھائی۔ آسیہ کے سامنے ایسی حرکت کر دی۔ اور پھر ایسی حرکت کیوں

کی کیوں؟ . . . . مجھے برا سا لگا۔ مجھے ڈر سا لگا۔ میں پریشان سی ہو گئی۔ میرا د
لگا . . . .

اور میں ہاتھ چھڑا کر دیوار کے ساتھ لگ کر خاموش کھڑی ہو گئی۔ میرے سر
کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا اور کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ اور آسیہ
بنی الماری میں سے پرچے ڈھونڈ رہی تھی۔ اختر نے کہا۔

پرچے تو ادھر والے کمرہ میں پلنگ کے ساتھ والی میز پر پڑے ہیں اور وہ
چلی گئی۔

اختر نے مجھے پکڑ کر پلنگ پر بٹھا لینا چاہا۔ مگر میں نے سختی سے کہا آپ نے
کرنی ہو۔ منہ سے کریں۔ مجھے ہاتھ مت لگائیں۔

کیوں! کیا میرے ہاتھ ایسے ہی گندے اور برے ہیں! اگر یہ برے ہیں تو لو
کاٹ لیتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ دانتوں تلے زور سے دبا لیا۔ اور پھر
دانت اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ پھر کہنے لگا:

اچھی زاہدہ! دیکھو! یہاں کرسی پر آن کر بیٹھ جاؤ۔ یہاں کھڑا ہونا کس قدر
ہے تم بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جانے میں بھلا کیا ہرج ہے! تم نے آج تک کبھی میری بات
لو بیٹھو یہاں اور میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا
تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وہی سحر اور التجا تیرنے لگی۔

اس نے پھر وہی کہا۔ زاہدہ! کیا تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔

کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی؟

میں نے اداس آواز میں کہا۔

"نہیں"

کیوں!

یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ آپ خواہ مخواہ میرا مذاق نہ بنائیں۔

خدا کی قسم۔ میں تمہارا مذاق نہیں بنا رہا۔ یقین کرو۔ میں تمہیں دل و جان سے

یں واقعی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

پھر آپ اگر میرے ساتھ مذاق نہیں کر رہے۔ تو اپنے ساتھ کر رہے ہیں۔

یں اپنے ساتھ مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ اپنے ساتھ خوشی کی بات کر رہا ہوں۔

زاہدہ! مجھے تمہاری قسم۔ جو میں جھوٹ بولوں۔ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور
سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

کیوں نہیں ہو سکتا زاہدہ!

ہم غریب لوگ اور آپ امیر لوگ۔ ہمارا اور آپ کا کیا رشتہ!

تم امیری غریبی کی بات نہ کرو۔ میں ایسی ہر بات سے آزاد ہوں۔ میں جس سے شادی
اچاہوں۔ اس سے شادی کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔

تمہارے گھر والے کبھی نہ مانیں گے۔

اگر وہ میری بات نہ مانیں گے تو کس کی مانیں گے۔

وہ اپنے وقار اور عزت کی بات مانیں گے۔

میرا نام ہی ان کا وقار اور عزت ہے۔ زاہدہ! تمہیں اس سے کیا۔ تم ایک دفعہ ہاں
د۔ اپنے دل کی بات بتا دو۔ پھر میں جانوں اور میرا کام۔ تمہیں اس سے کیا؟

اور میں خاموش ہو گئی۔ میں اور کیا کہتی! بھلا جسے اختر جیسا اچھا اور چاہنے والا خاوند
ائے۔ اسے کیا چاہیئے!

میری خاموشی پر وہ کہنے لگا

تو کیا میں تمہاری خاموشی کو ہاں سمجھ لوں۔

اور میں نے سر جھکا دیا۔

بس جی! اس کی تو باچھیں کھل گئیں۔ اور اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وعدہ کیا
ہ زندگی بھر میرا ساتھ دے گا۔ ہر حال میں ساتھ دے گا۔ سارے گھر والوں کو، خاندان
وڑ دے گا مگر مجھے نہ چھوڑے گا۔ اور یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ کو کئی بار چوما۔ اور

پھر میں آسیہ سے ملے بغیر گھر آگئی ۔

میرا دل خوشی کے مارے اچھل رہا تھا ۔ میرا جی چاہتا تھا گھر میں داخل ہوتے بھاگ کر والدہ کے سینے سے چمٹ جاؤں ۔ اور اسے بتاؤں ۔ سارا کچھ بتادوں ۔ سیڑھیاں طے کرتے ہی ننھی نسیمہ ملی میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور بہت پیار کیا ۔ میں بے حد خوش تھی میرا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا ۔ میں نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا تو سرخ ہو رہا تھا ۔

آج والدہ کہہ رہی تھیں کہ تو اتنی خوش کیوں ہے ؟ آج میں والدہ کو بہت دیر تک رہی ۔ ان کے مطلب کی باتیں کیں ۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی اور جو کام وہ کہتی رہیں کرتی رہی ۔

---

۶ ر فروری :-

ساری رات میں بالکل نہیں سو سکی ۔ ساری رات میرے خوابوں میں اختر چھایا کبھی ہم دونوں نیلگوں پہاڑیوں کو عبور کر رہے ہیں ۔ کبھی ہم وادیوں اور گھاٹیوں کو طے کر رہے ہم دونوں نے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں ۔ اور گھوم رہے ہیں ۔ میں نے بے حد خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور اختر مجھے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے ۔

رات بار بار نیند ٹوٹ جاتی تھی ۔ آج کی صبح بڑے ہی عجیب انداز سے طلوع ہوئی آج سورج نے بڑی شان سے آنکھیں کھولیں ۔ آج کی صبح کس قدر خوبصورت آسمان پر بادلوں کے خوبصورت جزیرے بنے ہوئے تھے ۔ نیلا آسمان اور ٹھنڈی ہوا ۔ میری آنکھیں ۔ اپنے آپ بند ہونے لگیں ۔

امی نے آن کر اٹھایا ۔ بیٹی! کیا آج نماز نہ پڑھو گی! جلدی اٹھو ۔ اسکول سے دیر ہو

لیکن امی دیکھو تو آسمان پر کتنے خوبصورت بادل چھائے ہوئے ہیں ۔ ہوا کتنی پیاری چل رہی ہے ۔ امی! آج تو سونے کا دن ہے ۔

پاگل بیٹی! بس بادلوں اور ہوا اور پھولوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہے ۔

چل اٹھ! اب بستر کو چھوڑ دے چل میری بیٹی! اور میں اٹھ بیٹھی!

اور جلدی سے تیار ہو کر اسکول چل دی ۔ وہاں پر آسیہ ملی ۔ اور اس نے مجھے گلے لگا لیا ۔ نہ جانے ہوں! کیا اسے علم ہو گیا ہے! میرا دل دھڑکا ۔ اور اس نے ہولے سے میرے کان میں جو بات تھا ۔ اور میں سرخ شفق بن گئی ۔

تو تم بھی مجھے بنانے لگ پڑی ہو ۔

میں بھلا کیوں بنانے لگی! اور پھر میں نے کیا بھی کیا ہے ؟ تمہیں تو خواہ مخواہ شک ہو گیا ہے ۔

کا ہے کا شک ؟

اچھا بتاؤ ۔ پرچے لائی ہو ؟

او نہوں!

تو پھر کیسے دو گی ؟

گھر آن کر لے جانا ۔

میں نہیں روز روز گھر آتی ۔

اب تو روز روز آنا پڑے گا ۔

امی کو آن کر پھر تم ہی منانا ۔

ہاں میں ان کو کہہ دوں گی ۔

اور دادا جان کو!

ان کو خدا بتا دے گا!

خدا کیا اسکول میں پڑھتا ہے ؟ اور کب آکر کہے گا ؟

آج سے دو سال کے بعد خدا آن کر کہے گا ۔ تب تیرا دادا خود تجھے دلہن بنا کر ہمارے

گھر رخصت کرے گا۔ سمجھیں!

اور دعا کے لیے گھنٹی ہوئی۔ اور دعا کے وقت میں نے سر جھکا کر خدا سے عاجزی سے دعا مانگی۔ کہ یا خدا میری مدد کرنا۔ مجھے بدنامی سے بچانا اور میرا ساتھ دینا۔

اور دعا مانگتے وقت میرا دل بھر آیا۔ اور دعا ختم ہونے کے بعد جب میں کلاس روم میں دا[خل] ہوئی تو میرے قدم سست تھے اور دل اداس۔

---

۱۵ فروری:-

آج ہمارے اسکول میں ہماری FAREWELL پارٹی تھی۔ کیونکہ پہلی مارچ امتحان شروع ہو رہے ہیں۔ اور امتحان کی تیاری کے لیے پندرہ چھٹیاں ہوتی ہیں۔

کل آسیہ ہمارے گھر آئی تھی۔ اور اس نے میری والدہ اور دادا جان کو منا لیا ہے کہ وہ ان چھٹیوں میں ہمارے گھر پڑھنے آیا کرے گی۔

آسیہ کو اپنا گھر دکھاتے ہوئے میرا چہرہ اداس تھا۔ ان کا گھر کس قدر خوبصورت ہے مگر ہمارا گھر ایسا نہیں ہے۔ کہیں آسیہ گھر جا کر اختر کو نہ بتا دے۔ اختر بھلا یہاں کیسے آیا کرے گا؟

اس سوچ نے مجھے اداس اور آزردہ کر دیا۔ اور میں سارا دن اداس رہی۔ خاموش خاموشی سے اسکول کو الوداع کہا۔ الوداع کہتے وقت میرا دل بھر آیا۔ مگر میری آنکھیں خا رہیں۔

آسیہ کے ہاں روزانہ جاتی ہوں۔ وہاں پر اتنا جی لگ گیا ہے کہ بڑی مشکل سے ت گزارتی ہوں۔ اور صبح کو پھر چل دیتی ہوں۔ آسیہ بھی دادا جان پر نہ جانے کیسا جادو پھونک ہے کہ وہ کچھ نہیں کہتے۔ آسیہ کی امی کس قدر اچھی ہے!

اور اختر کس طرح سارا سارا دن تنگ کرتا رہتا ہے؟ ذرا آسیہ ادھر ادھر ہوئی۔ اس نے آن کر باتیں کرنا شروع کر دیں اور ہاتھ چومنے لگتا ہے۔ بے چین سا ہو جاتا ہے ی باتیں کرتا ہے کہ شادی کے بعد یہ کریں گے وہ کریں گے۔

زندگی کتنی دلچسپ اور کتنی پیاری چیز ہے۔ پہلے میں کتنی اداس کرتی تھی۔ اداس تو میں اب بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہوں۔ لیکن اس اداسی کا کیا ہے! امتحان سر آگیا ہے!

پرسوں سے امتحان شروع ہو رہا ہے۔ خدا کرے میں اچھے نمبروں پر پاس ہو جاؤں ... اب تو پڑھائی میں وہ جی نہیں لگتا جو پہلے لگتا تھا۔

۱ر مارچ:-

آج جغرافیہ کا پرچہ تھا۔ جو بہت اچھا ہو گیا ہے۔ آسیہ کا بھی اچھا ہو گیا ہے۔ اختر نے بہت بہت مبارک دی ہے۔

۶۔ مارچ:-

پرچے بہت اچھے ہو رہے ہیں۔ ڈائری لکھنے کی فرصت نہیں مل رہی۔ امید ہے۔ باقی کے پرچے اچھے ہو گئے تو فرسٹ ڈویژن آجائے گی۔ خدا کرے۔ ایسا ہی ہو! آمین .....

پھر اختر کس قدر خوش ہو گا!

۱۶۔ مارچ :۔

آج آخری پرچہ تھا۔ آج امی سے اجازت لے کر زندگی میں پہلی بار۔۔۔ میں
آسیہ فلم دیکھنے گئے۔ درمیان میں اختر تھا۔ ایک طرف میں تھی۔ اور دوسری طرف آسیہ
"سہاگ رات" فلم دیکھی۔ فلم مجھے بے حد پسند آئی اور خاص طور پر گیتا بالی کا کیریکٹر
اور آسیہ کو یہ فلم پسند نہ آئی۔

رات کو آسیہ مجھے گھر چھوڑنے آئی اور دادا جان سے یہ کہا کہ ان کے گھر میلاد شریف
تھا۔ اس لیئے دیر ہو گئی۔

دادا جان نے کہا۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں میلاد شریف میں بیٹھنا تو
کا کام ہے۔ لیکن بیٹی! کاہے کے لیئے میلاد شریف کروایا تھا۔

امی نے کہا۔ کوئی کاہے کے لیئے میلاد شریف کراتا ہے۔ اللہ کا نام کوئی کسی
کے لیئے لیتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔

میرا مطلب۔۔۔۔ اچھا میلاد شریف کرایا تھا۔ بیٹھو بیٹی آسیہ اب کچھ
۔۔۔۔

نہیں میں اب جاتی ہوں۔

تو کیا اب اکیلے جاؤ گی!!

نہیں۔ میرا بھائی ساتھ ہے۔

تو اسے بھی اوپر لے آؤ۔

میرا بڑا بھائی ساتھ ہے۔

تو کیا زاہدہ بھی اس کے ساتھ ہی آئی ہے۔

میں ڈر گئی۔

آسیہ نے کہا۔ وہ بہت پیچھے پیچھے آر۔ ہا۔ تھا۔ اور ہم آگے آگے آ رہی تھیں۔ امی زینب
بھی ساتھ تھی۔ وہ پرلی گلی کی طرف مڑ گئی ہے۔

اچھا۔۔۔۔

آسیہ چلی گئی۔ مجھے ڈر تھا۔ بعد میں دادا جان کچھ نہ کہیں۔ مگر وہ خاموش رہے۔ اور کچھ
دیر کے بعد بولے۔

زاہدہ بیٹی! وہاں مت جایا کر۔ جن کے گھر جوان بھائی ہوں۔ وہاں نہیں جانا چاہیئے
اگر تو اب گئی۔ تو یاد رکھ میں تجھے بہت بری طرح ماروں گا۔

میں نے وعدہ کر لیا۔۔۔۔ دادا جان! اب کبھی نہ جاؤں گی۔۔۔۔ اور یوں وہ
خاموش ہو گئے۔

کیا مجھے وہاں نہیں جانا چاہیئے۔ ہاں واقعی نہیں جانا چاہیئے۔ کیونکہ پھر بعد
میں جب میری شادی وہاں ہو گی۔ تو وہ کہیں کچھ ایسی ویسی بات ہی نہ سمجھ لیں۔ اور
شادی کرنے سے انکار کر دیں۔

ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیئے۔ اختر سے تو اب میری ساری زندگی وابستہ ہے۔ اب
میں ہمیشہ کے لیے اسی کی اور صرف اسی کی ہوں۔

---

۲۸ مارچ

امتحان

کب کے ختم ہو چکے ہیں یا سکول بند ہو چکا ہے۔ سارا سارا وقت گھر پہ امّی
ساتھ کام کرواتی رہتی ہوں۔ آسیہ نے کئی بار بلا بھیجا ہے۔ مگر نہیں جا سکتی۔ دادا جان جانے کا
نہیں دیتے۔ موسم بدل رہا ہے۔ دھوپ میں کچھ تمازت سی آچلی ہے۔ جس سے دھوپ
بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے۔ چھاؤں میں بھی نہیں بیٹھا جاتا۔ بالکل ایسے جیسے نہ اس گھر میں رہنے
چاہتا ہے۔ اور نہ آسیہ کے ہاں جا سکتی ہوں۔

دادا جان کتنے عجیب ہیں۔ کیا بھلا ان کی یہ بندش میرے دل سے اختر کا خیال نکا
سکتی ہے!

کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں نکال سکتی۔

پھر کیا ہوا۔ اگر میں اختر سے نہیں مل رہی۔ اسے ملے کئی روز ہو گئے ہیں۔ مگر میں ا
روزانہ یاد کرتی ہوں۔ اور خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ دن جلد آئے۔ جب وہ مجھے بیاہ
اپنے گھر لے جائے۔ آمین۔ یا خدا میری اس آرزو کو ضرور پورا کرنا۔ اس کے بعد میں اس کے سا
نئے نئے ملک دیکھوں گی اور ساری دنیا کا سفر کروں گی اور اپنے بہن بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلا
گی۔ پھر بہت کچھ ہوگا۔

---

۴ - اپریل

آج آسیہ ہمارے گھر آئی تھی وہ چھٹیاں گزارنے کے لیے اپنے انکل کے پاس کراچی
جا رہی ہے۔ آسیہ میری امّی سے بار بار کہتی رہی کہ زاہدہ کو بھی ساتھ بھیج دو۔ مگر امّی بیچاری کیا کرتیں
کی ماں ہو کر بھی مجھ پر کوئی اختیار نہیں ہے جو اختیار ہے وہ صرف دادا جان کا۔ امّی کی قسمت
مالک بھی دادا ہے۔ میری، میرے چھوٹے بہن بھائیوں کی۔ اور اپنی محبت کا بھی۔ ہم کو
بھلا کیا اختیار ہے! . . . .

اچھی سہیلی آسیہ! تو خوش قسمت ہے۔ تو امیر گھرانے میں، پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا
ہوئی ہے۔ تیری قسمت بہت اچھی ہے۔ تو دنیا میں پھولوں کی طرح زندگی گزارنے کو آئی ہوئی
ہے اور ہم لوگ تو صرف رونے اور جلنے کو یہاں آئے ہیں۔ ہمیں کراچی سے کیا! ہمیں تو اپنے
شہر لاہور سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں تو اس گلی کے باہر، بلکہ اس مکان کے باہر کی دنیا سے
کوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو اس گھر پر بھی کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور تو کراچی کا کہہ رہی
ہے جیسے یہ بھی مکان کی اوپر والی یا نیچے والی منزل پر جانا ہے۔ ہم تو اوپر اور نیچے والی منزلوں

میں بھی دادا جان سے پوچھے بغیر نہیں جا سکتے۔ نہ صرف دادا جان سے پوچھنا پڑتا ہے
بلکہ ایسے کئی اردگرد دادا جان موجود ہیں۔ جن کا خیال کرنا پڑتا ہے۔

تو کراچی شوق سے چلی جا۔ مگر تیری بدنصیب سہیلی کہیں نہ جا سکے گی۔ تو کراچی جائے
گی گاڑی میں بیٹھ کر عجیب اور انوکھے راستے اور موڑ دیکھے گی۔ کراچی پہنچ کر سمندر دیکھے گی اور
میں نہ دیکھ سکوں گی۔

اے زاہدہ! جب تو کراچی جائے گی تو وہاں کی ہواؤں اور سمندروں کو میرا سلام کہنا۔ سمندر
میری ماں کی گود ہے۔ جس میں سو جانا چاہتی ہوں۔ امن اور سکون سے سو جانا چاہتی ہوں۔ کاش!
میں سنہری مچھلی ہوتی اور سارے سمندر میں نیلے نیلے پانیوں میں تیرتی پھرتی!

آسیہ! تو خواہ مخواہ اصرار کر رہی ہے۔ مجھے بھلا کس نے جانے دینا ہے۔

آسیہ نے بہت کہا۔ مگر توبہ کرو جی جو کہیں دادا جان اجازت دے دیتے۔

پھر آسیہ نے اتنی اجازت لے دی کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر جا سکوں اور شام
ہونے سے پہلے پہلے واپس آجاؤں۔ دادا جان نے تاکید کر دی کہ اگر ذرا سا بھی اندھیرا ہو گیا
اور تو نہ آئی۔ تو پھر میں تجھے اس گھر میں کبھی زندہ نہ رہنے دوں گا۔ بلکہ زہر دے دوں گا۔ ان
کا خیال تھا کہ اگر ایک لڑکی۔ بلکہ جوان لڑکی رات کو کہیں باہر اپنی سگی ماں کے پاس ہی کیوں
نہ رہے! یا کسی سہیلی کے پاس رہے! تو پھر وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اس لئے
مجھے پہلے ہی واپس آنا چاہیئے۔ میں نے آنے کا وعدہ کر لیا۔ اور چلی گئی۔

راستے میں چلتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے پنجرے سے نکل
کر کھلی ہوا میں آگئی ہوں۔

آسیہ نے بازار سے کچھ چیزیں خریدنی تھیں۔ پہلے وہ خریدیں اور پھر ہم گھر گئے۔ اس کے
گھر میں داخل ہوتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا
تھا کہ اختر کے سامنے کیسے جاؤں گی! کیونکہ بہت دن ہو گئے تھے۔ اُدھر گئے آسیہ کے کمرہ
میں کچھ دیر بیٹھے۔ آسیہ سامان وغیرہ باندھنے میں مصروف ہو گئی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت
ہوا اور اختر بھی آگیا۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ یہ بتاؤ اتنے روز تک تم آئیں کیوں

نہیں! یہ بھلا کیا بات ہوئی! ہم تو روزانہ یاد کریں۔ اور تم آدھی نہ اور اب تو آسیہ جا رہی ہے۔
تم بالکل ہی نہ آسکو گی۔ اور اگر ایسی ہی بات ہے۔ تو پھر میں تمہیں آج جانے ہی نہیں دوں گا
. . . .

اور نہ جانے کے خیال نے میرے سامنے موت کو لا کر کھڑا کر دیا بھلا کبھی ایسا بھی ہو
ہے۔ کہ میں گھر نہ جاؤں۔

میں نے اس سے کہا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں گھر نہ جاؤں۔ اور یہاں رہوں۔

ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟

کبھی نہیں ہو سکتا۔

اور اگر میں ایسا کر کے دکھا دوں تو!

میں سہم گئی۔ خدا کے لیے اختر ایسا نہ کرنا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا
میرے منہ سے اپنا نام سن کر اختر اس قدر خوش ہوا کہ میرے ہاتھ کو کئی بار چوم ڈالا
لگا پہلے یہ وعدہ کرو، کہ تم مجھے اختر نام سے ضرور پکارو گی۔ پھر شادی تک تمہیں رات
رہنے دوں گا۔

اور میں نے وعدہ کر لیا۔ . . . اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میرا ہاتھ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔
را پتہ نہیں یہ کیا عادت ہے کہ وہ میرا ہاتھ ضرور چومتا ہے۔ نہ جانے وہ کیوں ایسا کرتا ہے
. . . مجھے اس کا ہاتھ چومنا اچھا نہیں لگتا۔ میرے خوابوں کا شہزادہ تو ایسا نہیں ہے۔
بار بار ہاتھ چومے۔ میں اختر کو کہوں گی کہ وہ ایسا نہ کرے۔ شادی کے بعد بے شک چوم
ابھی چومنا گناہ ہوتا ہے۔ اور پھر محبت میں بھلا ہاتھ چومنا کیا ہوا۔ محبت تو ایک بہت
ا چیز ہے۔ جس میں صرف دو دل ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اور دور دور
ئے ہیں۔ اور نہیں لکھا جا رہا۔

اتی آوازیں دے رہی ہیں۔ اب تو لکھنا بھی بہت مشکل ہے۔ دادا جان کہتے
اگر جب تیرے امتحان ختم ہو گئے ہیں۔ تو اب بیٹھ کے کیا لکھتی ہے۔ ان سے چھپ
ڈائری لکھتی ہوں۔ دل کے اندر یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ میں ان سب باتوں

کو لکھتی بھی جاؤں۔ اگرچہ ڈر لگا رہتا ہے۔ کہ کہیں کوئی پڑھ نہ لے۔
ہائے اگر کوئی پڑھ لے تو غضب ہی ہو جائے۔ لیکن نہیں۔ میں تو اسے بڑا چھپا کر رکھتی ہوں۔ اور اگر کبھی کوئی ایسا وقت آیا تو انہیں جلا کر راکھ کر دوں گی۔

آسیہ چلی گئی ہے۔ اختر نے وعدہ لیا ہے۔ کہ میں کسی نہ کسی بہانے ضرور اس کے گھر آیا کروں۔ میں نے اسے کہا۔ کہ اس کی امی اور گھر والے کیا کہیں گے۔ کہ آسیہ تو ہے نہیں تو اب یہ آن کر کیوں بیٹھی رہتی ہے!

تو اختر نے کہا۔ کہ وہ پچھلا دروازہ کھول کر رکھا کرے گا اور میں چپکے سے آن کر چپکے سے چلی جایا کروں۔ مجھے یہ بات بڑی خوفناک لگی۔ بڑا ڈر لگا۔ یعنی چوروں کی طرح آؤں اور چوروں کی طرح جاؤں ...... ہائے اللہ! میں تو ایسا کبھی نہ کر سکوں گی۔ کبھی نہیں اور میں نے اختر کو صاف صاف کہہ دیا کہ میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔

مگر اختر نے بتایا کہ ایسا کرنے میں بالکل حرج نہیں ہے اس کے کئی ایسے دوست ہیں جنہوں نے اس کو بتایا ہوا ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے ایک اسکا دوست سلیم ہے جس کو ایک لڑکی ثریا سے پیار ہے گھر والے ملنے نہیں دیتے اور وہ یوں ہی چھپ چھپ کر آجاتی ہے اس میں بھلا کیا ہرج ہے! یہ بات اختر نے مجھے قائل کرنے کو کہی تھی۔ مگر مجھے یہ بات سن کر اور بھی خوف لگا اور میں یہ کہہ کر" کہ کوشش کروں گی آنے کی" چل دی
میں تو ایسا نہ کر سکوں گی

رات گئے دیر تک میں سوچتی رہی۔ موسم بہت اچھا ہو گیا ہوا ہے اور مجھے نیند نہیں
ں تھی۔ میں بستر پر لیٹی دیر تک اختر کے متعلق سوچتی رہی۔ اختر کچھ عجیب سا لڑکا لگتا ہے
نے کیا ہو گا! اور پھر اس کے دوست کیسے ہیں! وہ کون ثریا ہو گی جو اسے ملنے جاتی ہو گی
ہ جو کوئی بھی ہے۔ مجھے اس سے کیا۔!
مگر مجھے گھر سے جانے کی اجازت کیسے ملے گی!
مجھے دادا جان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ مجھے جانے کی
ت دے دیں۔
نہیں نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں جاؤں گی اور یہ فیصلہ کر کے سو گئی۔

آج ہمارے ہمسائے کے گھر میں رات بھر قوالی ہوتی رہی۔ بہت سے لگ جمع تھے۔ عورتیں اور مرد۔ عجب ہنگامہ برپا تھا...... دادا جان بھی سننے کو گئے ہوئے تھے۔ آج ہمارے گھر ہمارے رشتے کی ایک پھوپھی جان ہیں۔ وہ آئیں۔ بڑی باتیں کرتی رہیں..... ان کو کہیں مکان نہیں ملتا تھا۔ اور وہ بڑی پریشان تھیں..... دادا جان سے بہت دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہیں..... میرے متعلق بھی کرتی رہیں کہ کہیں رشتہ وغیرہ کیا ہے یا نہیں۔ والدہ نے کہا ابھی تو پڑھ رہی ہے۔ کہتی ہے میں نے شادی نہیں کرنی۔ پڑھ لکھ کر استانی بنوں گی۔

پھوپھی کہنے لگی۔ غضب خدا کا۔ کہیں ہم میں ایسا بھی ہوا ہے کہ جوان لڑکی کی شادی نہ کی جائے۔ اور اسے پڑھایا جائے۔ تیری تو مت ماری ہوئی ہے کہیں ایسا نہ کر بیٹھنا۔ تمہیں تو اس کی ہاں میں ہاں نہیں ملانی چاہیئے۔ وہ کہنے

لگیں ۔ میں تو سمجھاتی ہوں مگر ابھی بچی ہے نا ۔

مجھے اس کی یہ بات بہت بری لگی ۔ مگر میں خاموش ہو گئی ۔ اس کے جانے کے بعد میں نے امّی سے کہا ۔ امّی! اگر آپ نے اسے پھر یہاں آنے دیا تو میں کبھی آپ سے نہیں بولوں گی ۔ امّی کہنے لگی پگلی! اگر وہ یہاں آجائے ۔ تو کیا میں اسے نکال دوں !

دن گزر رہے ہیں ۔ پھوپھی نامراد روزانہ آتی ہے ۔ اور اب تو کل سے وہ باقاعدہ یہاں آن کر رہے گی ۔ جب تک اس کو مکان نہیں ملتا ۔ دادا جان کہتے ہیں یہیں آجائے ۔ سنا ہے اس کی ایک فتنہ بیٹی اور ایک رنڈوا بیٹا بھی ہے ۔ جس کی دو بیویاں مر چکی ہیں میں نے بہتیرا زور لگایا ہے ۔ میں روئی اور چیخی ہوں اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر وہ یہاں آن کر رہے گی تو میں گھر چھوڑ دوں گی ۔ امّی تو چپ چاپ رو دیتی ہیں ۔ مگر دادا گالیاں دیتا اور مارتا ہے ۔ یا خدا! میں کیا کروں! وہ تو ایک فتنہ عورت ہے اور پھر اسکا بیٹا یا اللہ ہماری مدد کر!

اس نامراد پھوپھی نے تو کل یہاں تک دادا جان کو کہہ دیا تھا کہ زاہدہ کو میری بیٹی بنا دیں ۔ میرا بیٹا تو اب لاٹ صاحب کے دفتر میں نوکر ہو گیا ہے ۔ سو روپیہ ماہوار کماتا ہے ۔

بڑے بڑے گھر والے اپنی بیٹیاں دینے کو تیار ہیں ۔ مگر میں تو اپنے ہی خاندان کی بیٹی

ہتی ہوں جو میرا چولہا سنبھال لے ۔ مجھ سے اس بڑھاپے میں کام نہیں جاتا ۔ اور دادا ان بھی گئے تھے ۔

یا خدا! یہ کیا بیٹھے بٹھائے مصیبت آنے والی ہے ۔ میری مدد کرنا ۔

کہاں میرے خوبصورت سوئٹزرلینڈ جا کر زندگی بسر کرنے کے خواب اور کہاں اسکا ڈا بیٹا ۔ جو جب سے لاٹ صاحب کے دفتر میں ۱۰۰ روپیہ ماہوار پر نوکر ہوا ہے اور ں نے دھوتی کی جگہ پینٹ پہننی شروع کر دی ہے ۔ اور سر پر تیل لگا کر ٹیڑھی مانگ نکالنی روع کر دی ہے ۔ سبھی رشتہ دار اپنی بیٹیاں اس کے ساتھ بیاہنے کے خواب دیکھنے لگے ۔ میرا اور اسکا بھلا کیا ساتھ! ان لوگوں کو کیا معلوم کہ میرا ذہن کیسا ہے! میرا تو ان باتوں دم گھٹتا ہے ۔ جن باتوں سے انکا چہرہ کھلتا ہے ۔

ہائے! مجھے ایک تنگ سے مکان میں ایک ظالم ساس اور نامراد قسم کے جواری سے ندگی کے ساتھ باورچی خانے کے دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں بیٹھ کر زندگی بسر نے سے تو موت لاکھ بار مبارک ہو ۔

میں تو کبھی یوں پسو کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتی ۔ میں تو تازہ ہواؤں اور کھلے نخلستانوں کی ہاں ۔ میں یہاں کیسے آگئی ہوں ۔

یا خدا! تو نے مجھے کہاں پیدا کر دیا ہے' اختر تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری زاہدہ کن مشکلوں یں پھنسی ہوئی ۔ کیا تم بھی مجھے اس مشکل سے نہ نکالو گے ۔

اختر! اس تاریک اور سیاہ رات کے اندھیرے میں اگر کوئی جگنو چمکتا ہے تو وہ صرف اں ہو ۔ صرف تم د

پھوپھی بمعہ اس رنڈوے کے ہمارے گھر آگئی ہے۔ اور نچلی منزل اسے دے دی گئی ہے۔ آسیہ کا نوکر کل رقعہ لے کر آیا تھا کہ آسیہ کی امی تمہیں بلاتی ہے۔ تم ضرور آؤ۔

جونہی اس کے نوکر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور پوچھا "زاہدہ بی بی ہے"؟

تو پھوپھی اور اس کے رنڈوے بیٹے۔ دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ بلکہ خود بھی کھڑے ہو گئے۔ کمرہ سے اٹھ کر ڈیوڑھی میں آگئے اور چک کے پیچھے سے باہر گلی میں جھانکنے لگے۔ میں نیچے اتری نسیمہ بھی ساتھ تھی۔ اس نے نوکر سے رقعہ لے لیا۔ میں نے دوسری طرف لکھ دیا کہ کل آؤں گی۔ اور اُدھر آگئی۔ دادا جان گھر پر نہیں تھے کچھ دیر کے بعد وہ آئے تو نیچے ہی بیٹھ رہے۔ پھوپھی نے دادا جان کو بتایا کہ کسی کا رقعہ آیا تھا اور اس نے مسکراتے ہوئے لیا۔ اور اس سے کہا کہ اب تم جلدی سے چلے جاؤ۔ کوئی آنہ جائے مگر میں اوپر کھڑی دیکھ رہی تھی ..... ماں تو اسکی اندھی ہے۔ مگر تو تو یوں عزت نہ بیچ آخر اس کی اور ہماری دو عزتیں نہیں ہیں۔ تو اس کو کہیں باندھ دے اب۔ ورنہ میری یہ بات یاد رکھنا کہ اس لڑکی کے رہنے والے لچھن نہیں ہیں۔ شام کو اکیلی کوٹھے پر چلی جاتی ہے اور تن تنہا بیٹھتی ہے۔ سوچتی رہتی ہے۔ کام کاج کرتی نہیں۔ مجھے دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیتی ہے۔ کل میں نے ننھے انجم سے کہا۔ جا بازار سے مجھے جا کر مرچیں لا دے۔ میں نے دفتر ردی بھیجنی تھی۔ اور مرچیں ہو گئی تھیں۔ میں نے انجم کو آواز دی۔ کہ جا کر بازار سے لا دے تو اسے اس نے سکھا دیا کہ جا کر کہہ دے میں کوئی نوکر نہیں۔

میں نے بھی بھائی! یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ یہ سب ناک کاٹنے والی باتیں ہیں۔

میرا کام تجھے سمجھانا تھا۔ اب سوچ سمجھ کر جلدی سے یہ کام کر ڈال۔

دادا جان بولے۔ دیکھ مجھے میں اس حرامزادی کا راتوں رات نکاح کر دیتا ہوں۔

پھوپھی بولی۔ خدا کے لیے ابھی اوپر جا کر کچھ نہ کہنا۔ کسی اور بات پر لو لنا..... ورنہ یہ ماں بیٹیاں کہیں گی کہ اسے آئے ابھی دو دن بھی نہیں ہوئے اور لگی لڑائیاں ڈالنے۔ کیا فائدہ!..... تم آرام سے بات کرنا یا کسی اور بات پر سمجھانا۔ اور پھر نیچے کھسر پھسر کی آوازیں آتی رہیں۔

میرا تو دل ہل گیا۔ اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا کہ اب تو وہ کچھ ہو گا جو کبھی نہ ہوا تھا۔ اور میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ امی سمجھاتی رہیں۔ مگر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔

آج آسیہ کے گھر جانا تھا۔ اختر میرا انتظار کر رہا تھا۔ مگر دادا جان صبح سے ہی ڈٹ کر گھر بیٹھ گئے تھے...... میں نے منہ ہاتھ دھو کر بال گوندھنے کے لیے کنگھی اٹھائی۔ اور آئینہ کے سامنے جا کھڑی۔ دادا جان نے گھور کر دیکھا اور اٹھ کر پاس آگئے۔

کہاں جا رہی ہو؟

میں نے سہم کر ڈرتے ڈرتے کہا۔

دادا جان جی! میری ایک سہیلی کی ماں بہت بیمار ہے۔ کل اس نے اپنا نوکر بھی بھیجا کہ خبر لینے کو ضرور آؤ۔ وہاں جانا ہے۔

دادا جان نے کڑک کر کہا۔

سہیلی کی ماں بیمار ہے۔ یا تیرا یار بیمار ہے۔

خدا کے لیے کچھ تو خیال کرو۔ یوں یار یار کا لفظ منہ سے کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں

آتی ۔

امّی نے آتے ہی دادا جان کو کہا ۔

دادا جان بولے :۔

توچپ رہ . . . .

کیوں چپ رہوں ! کیا میں اس کی ماں نہیں !

تو اندھی ہے ۔ ماں ہو یا نہ ہو ۔ مجھے اس کا نہیں پتہ ۔

اور تیری دو آنکھیں نہیں ۔ چھ آنکھیں ہیں ۔ آج تو چھ آنکھوں سے ہم کو دیکھ رہا ہ
دو تیری اور چار تیرے نچلے کمرہ میں رہنے والے رشتہ داروں کی ۔

خبردار ! جو تو نے زیادہ بکواس کی ۔ تو اس کو خراب کر کے چھوڑے گی ۔ تجھے تو کچھ
ہی نہیں آتا ۔

اور دادا جان کتنا زیادہ بڑبڑاتے رہے تھے ۔ میں خاموش ایک طرف بیٹھ
اور جب دادا جان بولتے ہوئے نیچے اتر گئے تو امّی نے آن کر پیار سے کہا ۔ مت جا
بیٹی تو وہاں ۔ تم نے کہہ دیا تھا کہ میرا دادا بڑا سخت قسم کا آدمی ہے ۔ وہ نہیں آنے د

اور میں رونے لگ پڑی ۔

اچھی اماں ! آج مجھے کسی طرح اجازت دے دو ۔ آج میں نے ضرور جانا ہے ۔
تے اسے کہلا بھیجا تھا کہ ضرور آؤں گی ۔ میری سہیلی میرا انتظار کر رہی ہوگی ۔

لیکن بیٹی میں تجھے کیسے بھیجوں !

تیری قسمت ہی ایسی تھی کہ وہ بھی نچلے کمرہ میں آن بسی ہے تو کچھ روز تک سہیلی
ہاں جانا بند کر دے ۔ یہ کہیں چالیس تو پھر چلی جانا ۔

امّی تو یہ کہہ کر کام میں لگ گئیں ۔ اور میں دیوار کے ساتھ منہ لگا کر رونے لگ
اختر میرا انتظار کر رہا ہوگا اگر میں نہ گئی تو وہ نہ جانے کیا سمجھے گا ! میرا دل کتنا چاہ ر
کہ بھاگ کر جاؤں . . . . ساری دیواریں اور دروازے توڑ کر اس قید خانے سے
جاؤں اور اختر کے چوڑے سینے کے ساتھ لپٹ کر روؤں ۔ خوب روؤں ۔ اور اسے

کہ میرا ظالم دادا ہم پر کس قدر ظلم کرتا ہے "!

وہ مجھے تم سے ملنے نہیں دیتا ۔ اگر اس کو ہمارا پتہ چل گیا تو وہ ذبح کر ڈالے گا ۔

اچھے اختر ! پھر کیا ہوگا ! پتہ نہیں کیا ہوگا ؟

میں کیسے جاؤں ؟ . . . . .

روتے روتے خود ہی چپ ہو گئی ۔ اور اداس سی ہو کر اوپر چھت پر آن کر لیٹ گئی ۔

دوپہر کو امّی نے کھانے کے لیے آوازیں دیں ۔ مگر میں نے بھلا کیا کھانا تھا ! ہمارے
پاس کھانے کو غم جو ہے ۔

امّی نے بہتیرا اصرار کیا ۔ مگر میں نے دوپہر کو روٹی نہ کھائی ۔ دو بجے کے قریب دادا جان
کے ایک دو بوڑھے دوست آ گئے جو ان کو ساتھ لے کر چل دیئے کہ آج رات خیر دین کے
گھر دعوت ہے ۔ ابھی چلو وہاں ۔ ذرا میلہ رونق رہے گا ۔

اوہ اللہ ! تو کس قدر اچھا ہے ! تو نے میری دعا سن لی ہے پتہ نہیں میری دعا سنی ہے
یا اختر کی . . . . کیا وہ بھی میرا انتظار کر رہا ہے ! . . . . ضرور کر رہا ہوگا ۔

میں ابھی جاؤں گی ۔ اور اختر کو سارا کچھ سناؤں گی ۔

اور پھر میں جلدی جلدی تیار ہو گئی

اختر کھڑکی کے ساتھ لگا میرا انتظار کر رہا تھا ۔ سیڑھیوں پر مجھے کوئی نہ ملا ۔ میں سیدھے
اختر کے کمرہ میں چلی گئی ۔

وہ اندر بیٹھا تھا ۔

پھر اس نے پوچھا کہ میں نے اتنی دیر کیوں لگائی ہے ! میری آنکھیں کیوں سوجی ہوئی
ہیں !

اور پھر میں نے رو رو کر سارا حال سنایا ۔

وہ یہ سارا کچھ سن کر چپ ہو گیا ۔ پھر میں نے اختر سے کہا ۔

اختر ! اب میں نہ آ سکوں گی . . . . . میرا آنا ہمیشہ کے لیے مشکل ہے ۔

اختر نے مجھے گلے کے ساتھ لگا لیا ۔ میرا سارا جسم لرزنے لگا ۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ

کہ میں کوئی فکر نہ کروں ۔ اس کے ہوتے کوئی مجھے کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ وہ چند روز کے اندر ہی ہمارے گھر رشتہ بھجوا دے گا اور پھر ۔ ۔ ۔ ۔ پھر زندگی ان کے لیے ایک ایسا دلنشین خواب بن جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ جسے کوئی بھی نہ توڑ سکے ۔

اس بات نے مجھے کس قدر خوشی بخشی تھی ! میں بیان نہیں کر سکتی ۔

پھر ہم کتنی ہی دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ اختر کس قدر اچھا ہے ۔

وہ لمحے کس قدر سہانے اور پیارے تھے جو اختر کے پاس گزرے ۔ اختر مجھے کتنا پیار کرتا رہا تھا ۔ وہ جب پیار سے میری طرف دیکھتا ہے تو میرا دل اتنی تیزی سے دھڑکتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی ۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے ۔ آج اس نے کئی بار میرے ہونٹوں کو چوما ۔ میرے ہاتھوں کو چوما اور ہونٹ چومتے ہوئے اختر نے بتایا تھا کہ وہ مجھے بے حد چاہتا ہے ۔

آج میرے ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کی سرخی پھیلی ہوئی ہے ۔ آج میرے ہونٹ چمک سے رہے ہیں ۔ کیا اختر سچ مچ سے پیار کرتا ہے ۔

لیکن پیار کو تو جسم سے کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ پھر اختر ایسا کیوں کرتا ہے ۔ وہ روحانی پیار کیوں نہیں کرتا ۔ جس میں ایک دوسرے کو گلے نہیں لگا جاتا ۔ بلکہ صرف ایک دوسرے کو پیار سے دیکھا جاتا ہے ۔ پیار سے سوچا جاتا ہے ۔ پتہ نہیں پیار کیا ہوتا ہے کیا پتہ ہونٹ چومنے کا نام ہی پیار ہوتا ہوگا ۔ اختر کو ٹھیک پتہ ہوگا ۔ اختر مجھ سے بڑا ہے اور میں اختر سے کتنی ہی چھوٹی ہوں ۔

اچھا اب اگر میں اختر سے ملی تو اس سے پوچھوں گی کہ اختر پیار کیا ہوتا ہے ؟ اور پیار کیسا ہوتا ہے ؟ ضرور پوچھوں گی ۔

لیکن یا خدا ! میرے پیار کا علم کسی کو نہ ہو ۔ یا خدا ! میری مدد کرنا ۔ ان لوگوں کو اگر پتہ چل گیا ۔ تو یہ لوگ مجھے زندہ جلا دیں گے ۔ پھر میں اختر سے کبھی نہ مل سکوں گی ۔

پھر اختر میرے بغیر کیسے زندہ رہے گا ۔ !

نہیں نہیں میں کبھی نہیں مروں گی ۔ میں اختر کے لیے زندہ رہوں گی ۔ میں اختر سے بہت

پیار کروں گی ۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے ۔ اسے دیکھ کر مجھے سارا کچھ بھول جاتا ہے ۔ صرف وہی یاد رہتا ہے ۔ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے ۔

کچھ روز کے بعد میری اختر سے شادی ہو جائے گی ۔ پھر ہمیں ملنے سے کوئی نہ روک سکے گا پھر ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے ۔ ہائے پھر کس قدر اچھا ہوگا ! وہ دن کب آئے گا ؟

کل سے میں باقاعدہ اٹھ کر نماز پڑھا کروں گی ۔ اور خدا سے دعا مانگوں گی کہ میری شادی اس سے ہو جائے ۔ ہائے ! دادا جان کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی ۔ سارے ہمسائے میری قسمت پر حیران رہ جائیں گے ۔ امی جس روز مجھے دلہن بنے کمخواب کے کپڑوں میں دیکھے گی تو کس قدر خوش نہ ہوگی ۔

میری نسیمہ بہن اور انجم بھیا ! دونوں خوشی سے ناچیں گے ۔ میں ان دونوں کے بغیر اداس ہو جاؤں گی ۔ میں امی کے بغیر بھی اداس ہو جاؤں گی ۔

پھر کیا ہوگا ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ہم یہ مکان ہی چھوڑ دیں گے ۔ آج میں نے اختر سے کہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ کہ اختر ! شادی کے بعد میں تمہارے ساتھ ملک ملک کی سیر کروں گی اور ہم ساری دنیا کا چکر لگائیں گے ۔ اختر میری یہ بات مان گیا تھا ۔ اختر کتنا اچھا ہے ۔

اچھے اختر ! ہمیشہ اچھے اختر رہنا ۔ بُرے اختر کبھی نہ بننا ۔ ورنہ میں مر جاؤں گی ۔

کل، سارا دن میں بہت خوش رہی تھی۔ اختر سے پرسوں ملی تھی۔ پرسوں کا دن خواب معلوم ہوتا ہے۔ ہر گزرا ہوا دن خواب کی طرح لگتا ہے۔ مگر آج میں بہت اداس ہوں آج ذرا سی بات پر دادا جان نے نسیمہ کو اس بُری طرح مارا کہ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی ہیں۔

اے ظالم دادا! تجھے اس معصوم پھول پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے ذرا رحم نہ آیا۔

میری نسیمہ بہن! میری جان نسیمہ بہن! آ میرے گلے لگ جا۔

...... یہ ظالم دادا تجھے کبھی نہیں مار سکتا۔ تو مت رو۔ تو مت دکھی ہو۔

آج نسیمہ نے جب پیار سے یہ کہا تھا کہ باجی! جب آپ کی شادی ہو جائے گی اور آپ یہاں سے چلی جائیں گی تو پھر مجھے کون پیار کرے گا۔

پھر دادا جان بہت مارا کریں گے۔

تو میں نے اسے بہت پیار کیا تھا اور کہا تھا کہ جب تک تو بڑی نہ ہو جائے گی میں شادی ہی نہ کروں گی۔ اور وہ خوش ہو گئی تھی۔

لیکن اس پگلی کو کیا خبر! کہ میری شادی تو بہت جلد ہو جائے گی۔ پھر میں نسیمہ اور انجم کو بہت اچھے انگریزی اسکول میں داخل کرا دوں گی۔ میں ان کو ہوسٹل میں داخل کرا دوں گی۔

مگر نہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو گا! آج دادا جان امی سے پھر رشتہ کے بارے میں کرتے رہے۔ پھوپھی اُدھر آن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی

چاہتا تھا۔ اس عورت کی دونوں آنکھیں نکال لوں۔ بھلا میرا اور اسکا کیا ساتھ! یہ تو آگ جلاتی ہے۔ اور چولہا گرم کرتی ہے۔ تو سارا کمرہ دھوئیں سے بھر جاتا۔ بہترا کہتی ہوں کہ کمرہ کے دروازے کھول دے۔ دھواں باہر نکل جائے دروازے نہیں کھولتی۔ اس کا تو دھوئیں میں بھی بیٹھ کر آنکھ سے آنسو نہیں نکلتا میرے تو یونہی بہنے لگتے ہیں۔

ہائے! میری پیاری ماں! کیا تو اپنی بیٹی کو اس دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرہ دم گھٹنے کو چھوڑ دے گی! ......

پیاری امّی! کیا تو میری شادی اس گندے سے میلے سے آدمی سے کر دے گی ہی مونچھوں پر روزانہ تیل کی مالش کرتا ہے۔ اور لاٹ صاحب کے دفتر میں سارا گزار کر جب رات کو گھر آتا ہے۔ اور ماں کے گھٹنے کے ساتھ لگ کر روٹی کھاتا ہے۔ اور روزانہ ماں کو کہتا ہے۔ ماں اب میری شادی کر دے۔ ورنہ میں خود لوئی لے آؤں گا۔ پچھلے دنوں اس نے کچھ روپیہ بھی اکٹھا کر لیا تھا۔ جس کا ایک یو بھی خرید لایا ہے۔ اور اب تو ماں کی خوشی کی حد ہی نہیں۔ کل اماں سے کہہ رہی ۔ ہائے بہن! ایسے گھر میں کون اپنی بیٹی نہ دے گا۔ جہاں ریڈیو بھی ہے۔ اور ایک ہی اکلوتا لڑکا ہے۔ کل کلاں کو گھر کی یہی مالک ہو گی۔ میرا کیا ہے۔ چند روز ندگی ہے۔ یہ گھر آ گئی۔ تو میری بھی آخرت اچھی ہو جائے گی۔ چین سے دن گزار ں۔ اور سنو بہن! اب مکان کرائے پر کیا لینا! ......

اب تو کچھ روز تک بیٹا مکان خود ہی خرید لے گا۔ چاچی عائشہ کی گلی میں ایک ن خالی ہوا ہے۔ اس کی بات چیت ہو رہی ہے۔ پکّی ہو گئی۔ تو انشاء اللہ کان لے لیں گے۔

اور میری اماں ہوں ہاں کرتی رہی۔ وہ تو یہاں بالکل میری شادی نہیں کرنا تا۔

مگر دادا جان کو کون منائے۔

اختر سے ملے کئی روز ہو گئے تھے ۔ یوں لگتا تھا جیسے اختر سے کبھی نہیں ملی تھی ۔ کبھی نہیں ملی تھی ۔ کبھی نہیں ۔ میری سہیلی سعیدہ آج آ گئی ۔ کہ چلو قدسیہ کے ہاں جا کر اپنا نتیجہ معلوم کرتے ہیں کہ پاس ہو گئے ہیں یا فیل کیونکہ اس کا بھائی یونیورسٹی ہے ۔ اور ہم نے رول نمبر اسے دیئے ہوتے تھے ۔ آج ۶ ۔ مئی ہے ۔ دس مئی ہمارا نتیجہ شائع ہو جائے گا ۔ آج سے ۴ روز کے بعد ۔

دادا جان گھر پر نہیں تھے ۔ امی کو کہہ کر میں سعیدہ کے ساتھ قدسیہ کے ہاں گئی دل دھڑک رہا تھا ۔ کہ خدا جانے یہ کیا خبر سنائے گی ۔ اس نے آتے ہی مبارکباد اور مجھے دوہری دوہری مبارکباد دی کیونکہ میرے ۵۶۶ نمبر آئے تھے ۔ اور میں میں فرسٹ آئی تھی اور مجھے وظیفہ بھی ملا تھا ۔

ہائے اللہ ! یہ خبر اتنی اچھی تھی کہ مجھے یوں لگتا تھا ۔ جیسے میری جھولی میں چاند ٹوٹ کر آن گرا ہے ۔ آسیہ فیل ہو گئی تھی ۔ جہاں ایک خبر نے مجھے خوشی پہنچائی تھی وہاں دوسری خبر نے مجھے اداس کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔

اب میں اختر کو جا کر سب سے پہلے یہ خوشخبری سنانا چاہتی تھی ۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔ یہ خیال کہ وہ آسیہ کا سن کر اداس ہو گا ۔ مجھے اداس کر رہا تھا ۔

بہر حال ۔ ۔ ۔ ۔ میں بغیر کوئی فیصلہ کئے سیدھے اس کے گھر کی طرف بڑھ گئی ۔ راستے میں سوچتی گئی کہ آسیہ کے فیل ہونے کا کس طرح افسوس کروں گی ۔ افسوس کرنا نہیں آتا تھا ۔

ایک دفعہ میری ایک پیاری سہیلی شکیلا مر گئی تھی ۔ حالانکہ وہ میری بے حد

پیاری تھی ۔ مگر چونکہ مجھے افسوس کرنا نہیں آتا تھا ۔ اس لیے میں ان کے گھر ہی نہ گئی ۔ نہ اس کا آخری دفعہ منہ دیکھا ۔ بلکہ گھر ہی میں روتی رہی ۔

آسیہ کا گھر آ گیا ۔ سیدھی اختر کے کمرہ کی طرف بڑھی ۔ دروازہ بند تھا ۔ تالا لگا ہوا تھا ۔ یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا ۔ کہ اتنی مشکل سے آئی تھی ۔ نہ جانے اب آنا کب ہو ۔ تو کیا کروں ! ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی میں کھڑی یہی سوچ رہی تھی ۔ کہ اختر آ گیا ۔

مجھے دیکھ کر اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں آ گئی ہوں ۔ پھر ہم اندر جا کر بیٹھ گئے اور پھر میں نے اسے اپنے پاس ہونے کا بتایا اور آسیہ کا بھی بتایا ۔ آسیہ کے فیل ہونے کا سن کر اس نے ذرا سا بھی منہ نہ بنایا ۔ بلکہ کہنے لگا پھر کیا ہوا ! ؟ اگلے سال پاس ہو جائے گی اور میرے نمبروں کا سن کر وہ خوشی سے پاگل ہو گیا ۔ کہنے لگا بتاؤ کیا تحفہ لو گی ! میں نے کہا کچھ نہیں لوں گی ۔ کچھ نہیں ۔ اس نے بہت اصرار کیا تو میں نے کہا اپنی تصویر دے دینا اور اس نے مجھے ایک بہت پیاری تصویر دے دی ۔ مگر یہ پوچھا رکھو گی کہاں !

میں نے کہا کہ اپنے کپڑوں کے صندوق میں ۔

اور وہ ہنس پڑا ۔

پھر وہ کہنے لگا کہ اب تو تم کالج نہیں داخل ہو گی ۔

مگر یہ سن کر بہت اداس ہو گئی ۔ بھلا میں کہاں کالج میں داخل ہو سکتی ہوں ! یہ تو خواب میں بھی ممکن نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اسے بتایا کہ دادا جان مجھے کسی قیمت پر بھی کالج میں داخل نہیں کرنا چاہتے ۔ اب تو وہ میری شادی کر رہے ہیں ۔ اور پھر میں نے اسے لڑکے کا بھی بتا دیا ۔

اختر یہ سن کر چپ ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ اور تھوڑی دیر کے بعد پھر خود ہی بولا کہ میں آج رات امی سے بات کر لوں ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کم از کم بی اے ضرور کر لو ۔ اس کے بعد شادی کریں گے ۔ ہم منگنی اب کر لیں گے اور شادی چار سال کے بعد ۔ میں آج رات امی سے بات کر دوں گا ۔ تاکہ وہ پیغام لے کر تمہارے کالج میں داخلے سے پہلے پہلے منگنی کی بات

پکی کرلیں۔ پھر تو تمہارے دادا جان کو پڑھانے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔
مگر میں نے کہا۔ اختر تمہاری امی کیسے مانیں گی!
مگر اختر نے کہا۔ تم اسکا کوئی خیال نہ کرو۔ اس کے بعد میں دو تین گھنٹے اس کے
پاس رہی۔ وہ مجھے بہت پیار کرتا رہا۔ کبھی میری آنکھوں کی تعریف کرتا اور کبھی
لمبے بالوں کی۔ کبھی میرے بھولے بھالے چہرہ کی۔ اور کبھی میری سادی طبیعت کی
آج پاس ہونے کی خوشی میں اس نے مجھے بہت پیار کیا۔ واپسی پر گھر آتے
میں نے اسے پھر کہا۔ اختر! داخلے تو کل شروع ہو رہے ہیں۔ دس روز تک
تم دس دنوں تک بات پکی کرلینا۔ ورنہ بہت بری بات ہوگی۔
اور اختر نے پکا وعدہ کرلیا۔ اور پھر میں آگئی۔
بہت دیر ہوگئی تھی۔ شام ہوگئی تھی۔ مگر آج مجھے کوئی ڈر نہیں لگ رہا تھا
آج میں نے پاس ہونے کی خوشخبری گھر میں سنانی تھی آج بے شک دیر ہو
گھر آتے ہی امی کو یہ خبر سنائی۔ دادا جان کو بتایا۔ دادا جان کا غصہ سے
چہرہ خوشی کے لطیف جذبات میں بدل گیا۔ اور انہوں نے زندگی میں پہلی بار
پیار کیا۔ ان کے پیار کرنے سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور میں رو
پڑی۔

دادا جان حیران ہوگئے کہ خوشی کے موقعہ پر یہ آنسو کیسے؟
اے دادا! تجھے کیا خبر! کہ تیرے اتنا سا پیار کرنے سے میرا دل کیا
میرے ذہن میں تو تیرا تصور ایک ظالم دادا سے زیادہ نہیں تھا۔ کہ آج تو نے یہ
کیسے دیا!
پھوپھی اور اس کے لڑکے کو بھی پتہ چلا۔۔۔۔ پھوپھی بولی کیسی کو کچھ
پاس ہوگئی ہوگی۔۔۔۔۔ آتی جاتی تو رہتی ہے۔ رقعے بازی بھی ہوتی رہتی ہے
اس کی اس بات نے میرا دل جلا کر راکھ کر دیا۔ آج امی بھی بہت خوش
رات گئے جب سب سو گئے۔

نیلے آسمان کی تاروں سے بھری ہوئی چھت کے نیچے جب ہم سب لوگ لیٹے اور
صرف میں اور امی جاگتی رہ گئیں۔ تو امی نے کہا:
بیٹی! اب میں چاہتی ہوں کہ میرے جیتے جی تیری شادی ہو جائے۔۔۔۔۔
تم نے میرا حال دیکھا ہے۔ دن بدن موت کے قریب ہوتی جا رہی ہوں
اور پھر رشتہ دار بھی طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے۔ ہمارے
خاندان میں کوئی پڑھا لکھا شخص تو ہے نہیں تو زیادہ پڑھ گئی ہے تو شادی
کے لئے مشکل ہو جائے گی۔ ہم غریب لوگ ہیں اور پھر ہمارے پاس اتنا پیسہ بھی
نہیں ہے کہ تجھے آگے پڑھا سکیں۔
میں نے کہا۔ امی! مجھے تو ۲۵ روپے ماہوار وظیفہ بھی ملے گا۔ فیس کی اب کوئی فکر
نہیں وہ معاف ہو جائے گی۔ اور ۲۵ روپے ہر مہینے مفت ملا کریں گے۔
اچھی ماں! میں نے ابھی شادی نہیں کرنی۔ میں جب تک کوئی اچھا لڑکا نہ ہوگا شادی
نہیں کروں گی۔
امی کہنے لگی۔ اس پھوپھی کے لڑکے سے تو تیری شادی نہیں ہونے دوں گی۔ مگر
خالہ زینب کا لڑکا جو بنک میں نوکر ہے۔ میٹرک پاس ہے اور دو سو روپیہ تنخواہ لیتا ہے وہ
بڑا نیک لڑکا ہے۔ میں چاہتی ہوں وہاں تیری شادی کر دوں۔ شادی کے بعد تم بیشک
آگے پڑھ لینا۔
میں نے کہا۔ اچھا امی! شادی کرلوں گی۔ مگر یہاں نہیں۔ میں اپنی مرضی آٹھ روز
کے بعد بتاؤں گی۔
اور امی مطمئن ہو کر سو گئیں۔
میں اندر ہی اندر ہنستی رہی۔ بھلا میں امی کو خود ہی کیسے بتا دیتی
۔ امی کو پتہ چل جائے گا۔ کل یا پرسوں تک آسیہ کی امی ضرور آئیں گے۔
کہیں وہ ہمارا غریب سا گھر دیکھ کر برا نہ منائے۔۔۔۔ اگر کہیں ایسا ہوگیا تو۔۔۔۔

مگر نہ جانے ایسے منحوس خیال کیوں میرے دل میں آنے لگ جاتے ہیں۔ توبہ! بھلا اختر!
بات اس کی امّی کبھی ٹال سکتی ہیں! کبھی نہیں۔

اور یہی سوچتی ہوئی مجھے نیند سی آنے لگی ..... اس وقت رات کے ۹ بج چکے
تھے دور کہیں ریڈیو پر فرمائشی پروگرام نشر ہو رہا تھا ..... ریکارڈ بج رہا تھا۔

آئی۔ آئی شام سہانی ....

سن رے خوشی کی کہانی   سن رے خوشی کی کہانی

بڑی ہی پیاری ہوا چل رہی تھی ..... موسم بڑا سہانا تھا ..... اس موسم میں سکون
سکون کی نیند آنکھوں میں لیئے خاموشی سے سوگئی ..... کیونکہ سونے کے بعد میں نے بڑے
پیارے پیارے خواب دیکھے تھے۔

چھ روز ہو گئے ہیں۔ مگر اختر نے ابھی تک اپنی والدہ کو نہیں بھیجا۔ نہ جانے کیا بات
ہوگئی ہے! کیا آسیہ کے فیل ہونے کا اسے صدمہ ہوا ہے! .... کیا اس کی امّی بیمار
گئی ہے! نہ جانے کیا بات ہوئی ہے! اختر نے بھیجنے کا پکا وعدہ کیا تھا۔ اختر جھوٹ
نہیں بول سکتا۔

پھر کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا!

اچھا کل دادا جان کام پر جائیں گے۔ تو جا کر پتہ لوں گی۔ کیونکہ ایک دو روز تک
پھر داخلے بند ہو جائیں گے۔

آج میں آسیہ کے ہاں گئی۔ پتہ چلا کہ اختر آسیہ کو لینے کراچی گیا ہوا ہے۔ یہ سن کر
میری جان میں جان آگئی۔ اور میں خوش ہو گئی۔

اس کی امّی کہتی ہو گی۔ میں اکیلی کیسے جاؤں! آسیہ کو لے آؤ اکٹھے جائیں گے۔ ایک دو
روز تک اختر ضرور آجائے گا۔

میں لیٹ فیس دے کر کالج میں داخل ہو جاؤں گی۔ پھر میں گھر آگئی۔ اور مطمئن ہو گئی

داخلے بند ہو چکے ہیں مگر اختر ابھی تک نہیں آیا۔ اسے گئے ۲۰ روز ہو گئے ہیں۔
اختر کیوں نہیں آیا؟

اختر کہیں بیمار تو نہیں ہو گیا؟

اچھے خدا! اختر کو بہت جلد واپس لے آ۔

یا خدا! میری دعا سن لے ....

اختر ابھی تک نہیں آیا۔ چار روز اور بیت گئے ہیں۔ کل میں ضرور اس کے
گھر جا کر پتہ کر دوں گی ....

موسم کس قدر بُرا آگیا ہے ۔ گرمیوں کا موسم مجھے بہت زہر لگتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔
بہت دکھ دیتا ہے ۔ ہمارے پاس نہ بجلی کا پنکھا ہے ۔ نہ خس کی ٹٹیاں ۔

یا خدا! یہ گرمیوں کا موسم کیسے بیتے گا؟ کالج گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے بند ہو
چکا ہے ۔ دادا جان کی کس قدر منتیں نہیں کیں ۔ مگر وہ نہ مانے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دادا جان
کبھی نہ مانیں گے ۔

کالج اب ستمبر میں کھلے گا ۔

ہائے! مجھے پڑھنے کا کس قدر شوق ہے ۔ تو پھر کیا کروں گی ۔ لیکن نہیں
میں ضرور داخل ہوں گی ۔ چاہے کچھ ہو جائے ۔ ضرور داخل ہوں گی ۔

اختر! تم کہاں چلے گئے ہو تم نے کچھ بتایا بھی نہیں ۔ اور چلے گئے ہو ۔

کتنا اچھا ہو ۔ جو میں کل گھر میں داخل ہوں اور تم آجاؤ ۔

کیا تم مجھے کل ملو گے نا! ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا لوگ کہتے ہیں کہ سچے دل ضرور ملتے
میں دیکھوں گی تم مجھے ملتے ہو یا نہیں ۔

آج میں آسیہ کے ہاں گئی ۔ تو اختر کو دیکھ کر حیران رہ گئی ۔ میرا جی چاہتا تھا ۔ بھاگ
کر اس سے لپٹ جاؤں ۔ اور پھر رو رو کر کہوں ۔ کہ تم کہاں چلے گئے تھے اختر ۔ ۔ ۔ ۔
اختر! اتنے روز کہاں رہے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جاؤ
۔ ۔ ۔ ۔ میں تم سے نہیں بولتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں خاموش رہی ۔

اختر نے مجھے دیکھتے ہی معذرت پیش کرنی شروع کر دی کہ آسیہ کی تار آگئی تھی ۔
کہ وہ گر پڑی تھی ۔ میں فوراً آگیا اسے ہسپتال داخل کرایا اور اب کہیں جا کر وہ کچھ ٹھیک ہوئی ہے
میں نے بہت فکر کا اظہار کیا ۔ آسیہ کا ایڈریس لے لیا ۔ تاکہ اسے خط لکھوں مگر اختر نے کہا کہ
خط میں چوٹ وغیرہ کا بالکل ذکر نہ کرنا ۔ اس نے مجھے منع کیا تھا کہ میں تمہیں نہ بتاؤں ۔ کیونکہ
تم فکر کرو گی ۔

میں حیران ہو گئی ۔ آسیہ نے یہ بات کس جذبے کے تحت کی ہے ۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔
اس کے بعد اختر بیٹھا باتیں کرتا رہا ۔ سفر کی باتیں ۔ ادھر ادھر کی باتیں ۔ پھر پیار کرتا رہا
مگر شادی اور کالج کی کوئی بات اس نے نہ کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے بھی بات کرنی مناسب نہ
سمجھی اور آگئی ۔ میرا دل بہت اداس اور پریشان تھا ۔

اختر نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ہفتے میں ایک روز اسے ضرور ملنے آؤں ۔ ۔ ۔ ۔
پھر وہ مجھے بہت سی باتیں بتائے گا ۔

گھر آن کر میں نے امی کو آسیہ کا بتایا کہ وہ گر پڑی ہے امی نے بھی بہت افسوس کا اظہار کیا
امی بازار سے کپڑا خرید کر لائی تھی ۔

پھر میں نے بیٹھ کر شام تک نسیمہ اور انجم کی قمیضیں تیار کیں۔ میں اپنے خیالوں میں اور قمیضوں
کے سینے میں اس قدر محو ہوئی کہ مجھے شام ہونے کا پتہ ہی نہ چلا۔
دو دنوں کے لیے ساتھ کی ہمسائی سے مشین مانگی ہوئی ہے۔ کل اور پرسوں دو دنوں میں
کو سارے کپڑے تیار کرنے ہیں گرمیوں میں موٹے کپڑے نہیں پہنے جاتے۔

پندرہ روز گزر گئے ہیں آسیہ کے ہاں نہیں گئی۔ حالانکہ اختر نے ہر ہفتے آنے کا
ہوا تھا۔ میرا دل کتنا غمگین اور اداس ہے۔ دادا جان ستمبر کے مہینے میں میری شادی کا
چاہتے ہیں۔
نہ جانے کیا ہونے والا ہے! کیا اختر کو اس چیز کا خیال نہیں ہے میں اختر کو ساری
بتا چکی ہیں۔ اب بار بار کیا بتاؤں! ......
اچھا کل آخری بار اسے جا کر ضرور کہوں گی۔ کہ ستمبر میں میری شادی ہو رہی ہے

آج میں اختر کے ہاں گئی تو وہ سامان باندھنے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ
اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میرا دل دکھ سا گیا۔ ..... میں چند منٹ کھڑی
اور پھر واپس آنے لگی تو اس نے آواز دے کر ٹھہرا لیا۔
کہنے لگا۔ میں تم سے خفا ہوں۔ تم اتنے روز کیوں نہیں آئیں؟ میں تمہیں روز
یاد کرتا تھا۔ روز تمہارا انتظار کرتا تھا۔ مگر تم کس قدر ظالم اور بے وفا ہو۔ میں نے کہا
اور بے وفا میں ہوں یا آپ!
کیوں میں کیسے ہوں! میں اگر تمہارے گھر آ سکتا تو تم دیکھتیں۔
کہ روزانہ آتا۔ بلکہ وہیں رہتا۔
اچھا۔

ہاں۔ تو کیا تمہیں شک ہے!
نہیں۔ بالکل نہیں۔ آپ نے روزانہ آنے کو ٹھیک ہی تو کہا ہے۔
اچھا آسیہ کا حال بتائیں۔ وہ کیسی ہے!
اب تو بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔
اور یہ سامان کیا باندھا جا رہا ہے؟ کہاں بھاگنے کا ارادہ ہے!
بھاگنا کہاں ہے؟ کوہ مری جا رہا ہوں...... یہاں گرمی میں نہیں رہا جاتا....
ستمبر میں واپس آنے کا ارادہ ہے۔ چلو گی تم بھی ساتھ!
میرا دل بھر آیا تھا... اور میں بول نہ سکتی تھی۔ میں نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور خاموشی
سے زمین کو تکنے لگی۔
بولو کیا چلو گی میرے ساتھ؟
نہیں۔
کیوں؟
میری مرضی!
کیا مجھ سے خفا ہو؟
لڑائی کب ہوئی تھی؟
نظر تو ایسا ہی آتا ہے۔
نظر تو ویسا بھی آ سکتا ہے۔
یہ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے؟
مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔
پھر اختر اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ اور ہاتھ سے میرا چہرہ پکڑ کر ادھر کرنے لگا۔ میں
نے کہا۔
مجھے نہ ہاتھ لگانا۔

اختر نے ہنس کر کہا۔ کیوں ؟ یہ کیا ہو گیا ؟
مجھے ہاتھ لگانا اچھا نہیں . . . . .
سیدھی طرح کیوں نہیں کہہ دیتیں ۔ کہ تم اب اچھے نہیں لگتے اب کوئی اور اچھا لگتا ہو گا ۔
میں تڑپ اٹھی ۔ اور کہا ۔ ایسی بات پھر کبھی نہ کہنا ۔
یہ کوئی اتنی بری بات نہیں ہے ۔
تمہارے لیے بالکل معمولی بات ہو گی ۔ مگر میرے لیے یہ برائی کی آخری بات ہے
بھئی کمال ہے ۔ تم بھی حد کرتی ہو ۔ مذاق کی بات کو اتنا (SERIOUS) لے لیتی ہو ۔
مذاق کا بھی کوئی وقت ہونا چاہیئے ۔
وقت تم بتا دو . . . . . میں نے تو یونہی بات کر دی تھی ۔
اچھا تو میں چلتی ہوں ۔
ابھی نہیں جا سکتیں ۔
کیوں ؟
بس ۔ میری مرضی !
تم کون ہو ؟
میں تمہارا اختر ہوں ۔
تم میرے کچھ بھی نہیں لگتے ۔
لیکن پہلے تو کچھ لگتا تھا ۔
میں کچھ نہیں جانتی ۔
مگر زاہدہ ! تمہارا مزاج کیوں خراب ہو گیا ہے ۔ بتاؤ نا ۔ تمہیں کیا ہوا ہے ؟
میں چند لمحے خاموش رہی ۔ اور جب اس نے دوبارہ میرا چہرہ پکڑ کر ادھر کیا ۔ تو میرا منہ

چومنے لگا تو میں جلدی سے پیچھے ہٹ گئی ۔ اور دیوار کے ساتھ منہ لگا کر سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی ۔ اور پھر اتنے آنسو بہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں ۔ اختر بہتیرا چپ کراتا رہا ۔ مگر میرے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے ۔
پھر اختر نے مجھے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا ۔ اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گیا ۔ اور پوچھا
بتاؤ ۔ کیوں رو رہی ہو ؟
مجھے کچھ نہیں ہوا اختر ۔
تو تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہو ۔
بلکہ یہ کہنا چاہیئے ۔ کہ اختر اب تم مجھے بے وقوف نہ بنا سکو گے ۔ تم اچھا بھلا جانتے ہو اور پھر یہ کہتے ہو ۔
بھئی زاہدہ ! دیکھو ۔ سیدھی سیدھی بات کرو ۔ دیکھو میری طرف دیکھو ۔
کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں !
نہیں بتاؤں گی ۔
اچھا نہ بتاؤ ۔ میں جانتا ہوں ۔ تم مجھ سے پیار کرتی ہو ۔
تم غلط جانتے ہو ۔ میں پیار نہیں کرتی ۔
اچھا تو یوں کہہ لو کہ اختر تمہیں پیار کرتا ہے ۔
ہاں اختر مجھے پیار کرتا ہے اور میں زاہدہ اختر کو پیار نہیں کرتی ۔ اور اختر اس قدر پیار کرتا ہے کہ اس کے پیار سے میری آنکھیں چندھیا گئی ہیں ۔ ہیں نا ۔
تو کیا تمہیں شک ہے ! اچھا لو ۔ آؤ سارا غصہ تھوک دو ۔ بھلا جانے سے پہلے مجھ سے کیوں خفا ہوتی ہو ۔ کیا پتہ میں ہی مر جاؤں ۔ اور واپس ہی نہ آؤں ۔ پھر ! . پھر تو تم بہت خوش ہو گی ۔
ہاں . . . . . خوش کیوں نہیں ہونا اختر ! . . . . . تمہاری یہ دکھی کر دینے والی باتیں کبھی فراموش نہیں کروں گی ۔
تو کیا تم کو میرے مرنے کا افسوس ہو گا ۔

تو کیا تم نہیں جانتے کہ مجھے افسوس ہوگا!

نہیں کاہے کا افسوس ہوگا؟

اچھا نہیں ہوگا۔ نہیں ہوگا۔ اس بات کا تمہیں بہت جلد یقین آگیا ہوگا۔ ہیں نا۔

بس اسطرح بہت بحث ہوتی رہی۔ پھر میں خاموش ہوگئی۔ میں نے اسے ایک بار بھی نہ کہا۔ کہ تم نے تو ہمارے گھر پیغام بھیجنا تھا اور یہ کہ میری شادی ستمبر میں ہو رہی ہے اور تم ستمبر میں کوہ مری بیٹھے ہوگے۔ پھر میں نے کہا۔

اختر! کیا تم میری شادی پہ آؤ گے!

تمہاری شادی پہ نہیں آنا۔ تو اور کس کی شادی پہ آنا ہے۔

اچھا!

کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟

ستمبر کے آخر میں۔

کالج میں داخل نہیں ہوگی؟

نہیں دادا جان بالکل اجازت نہیں دیتے۔ وہ تو ایک جگہ بات پکی کر رہے ہیں

تو تم نے انہیں منع کیا ہوتا۔

میری بات بھلا کون سنتا ہے؟

اختر کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

میں نے امی سے بات کرنی تھی۔ مگر ان دنوں امی کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ تم فکر نہ کرو ستمبر میں آن کر سارا کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ پھر میں امی کو منا لوں گا۔

میں خاموش رہی۔

پھر اختر کتنی ہی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا کبھی گانے لگ جاتا۔ کبھی چیزیں اکٹھی کرتا۔ کبھی مجھے پیار کرتا۔ بس یونہی وقت گزر گیا۔

پھر اختر نے خدا حافظ کہا۔ اور کہا کہ اچھا ہوا۔ جو تم آج آگئیں ورنہ میں نے دو مہینوں کے بعد ملنا تھا۔

اور پھر میں آگئی۔ میں سارا راستہ روتی رہی۔ نہ جانے کیوں اس کے گھر سے ہر نکلتے ہی میری آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ ابل پڑا۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر آنسو رکنے ام ہی نہ لے رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔ بڑی مشکل سے میں نے گھر کے قریب پہنچکر و خشک کیے۔ گھر میں داخل ہوئی تو ڈیوڑھی کے پاس ہی پھوپھی کھڑی تھی۔ اس نے ھے گھور کر دیکھا۔ میں اُدھر آگئی اور چپکے سے کوٹھے کی چھت پر جا کر لیٹ گئی۔

نے پوچھا۔ کیا ہوا تجھے!

میں نے آواز کو درست کر کے بڑی چہک کر کہا۔ جیسے بہت خوش ہوں۔ امی! ل ٹھیک ہوں۔ کچھ نہیں ہوا۔ اور میں خاموشی سے دیوار سے ٹیک لگا کر چارپائی بیٹھ گئی۔ اور سامنے خلا کو گھورنے لگی۔ آج میرا دل کس قدر ویران تھا! یہ میں بتا سکتی۔ میری زندگی کے چمن میں بہار آنے سے پہلے ہی رخصت ہوگئی۔ میری خوشی پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔ مجھے اپنے چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آئی۔ یہ ہوگیا؟

وہ کیسی صبح ہوئی تھی جس کی اتنی جلدی شام بھی ہوگئی!

وہ روشن دن کدھر گیا؟

کیا ہونا تھا۔ اور کیا ہوگیا؟

اختر نے تو کوئی بھی پرواہ نہیں کی۔ اختر نے تو وہ جوش و خروش دکھایا ہی نہیں جس اس نے شروع میں یقین دلایا تھا۔

اب کیا ہوگا؟

اختر جا رہا ہے۔

کل وہ کوہ مری پہنچ جائے گا خوبصورت اور سرد پہاڑوں پر وہ کل کی رات سکھ اور ین سے سوئے گا۔ ۔ ۔ ۔ مگر مجھے کیسے نیند آئے گی!

میں اختر کو جانے سے کیسے روکوں؟

میں نے تو اسے ایک بار بھی نہ روکا . . . . شاید وہ رک جاتا . . . . لیکن شاید وہ نہ ہی رکتا ۔ لیکن میں اسے ایک بار تو کہہ لیتی ۔ شاید وہ نہ ہی جاتا ۔

اختر! مت جاؤ . . . . میں یہاں تین مہینے کیسے گزاروں گی اگر جانا ہی ہے تو پھر مجھے بھی ساتھ لے چلو ۔ اختر! میں کیسے زندگی کے دن گزاروں گی ۔ اور پھر میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی ۔ شام ہوتی گئی ۔

اندھیرے کا سورج ہر چیز کو لے کر ڈوب گیا ۔

میں بالکل بے حس و حرکت اوپر لیٹی رہی ۔

پھر امّی نے بہت آوازیں دیں ۔ تو اٹھ کر نیچے آئی . . . . اپنا چہرہ چھپاتی رہی ۔ اپنا دکھ چھپاتی رہی ۔ کس کو سناتی ؟ یہ دکھ کس نے دیا نہیں ۔ خود ہی مول لیا ۔ اس دکھ کو کیسے بتاتی ؟ اس دکھ کا کیا نام تھا ۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی ۔ روشنی کی طرف سے پیٹھ کر کے اندھیرے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی ۔

ہنسی مذاق کی باتوں پر بے تحاشا ہنستی رہی ۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آنسو بھی پونچھتی جاتی تھی ۔

آج میں ان لوگوں کے درمیان بے آس دل اور ویران چہرہ لیے بیٹھی تھی ۔ میرا دل دکھ گیا تھا ۔ مگر کسی کو علم نہیں ۔

سامنے دادا جان بیٹھے اپنے کاغذوں کو دیکھ رہے ہیں ۔ انہوں نے الماری کھو ہوئی ہے اور چہرے کے ساتھ کاغذوں کو لگائے پڑھ رہے ہیں ۔

نسیمہ نل سے پانی لا کر حمام کو بھر رہی ہے ۔ انجم بازار سے کچھ خریدنے گیا ہوا ہے والدہ باورچی خانے میں بیٹھی آٹا گوندھ رہی ہیں ۔

میری امی کتنی کمزور ہو گئی ہیں ۔

ان کا رنگ کتنا زرد ہوتا جا رہا ہے ۔

پتہ نہیں ان کو کیا ہو گیا ہے ! ابا کے مرنے کے بعد سے تو ان کی حالت دن بدا

ہڑ ہوتی جارہی ہے . . . .

ڈاکٹر نے کام کرنے کو بالکل منع کیا ہوا ہے ۔ مگر پھر بھی کرتی ہیں ۔

میری امّی! میں کل سے تمہیں کوئی کام نہ کرنے دوں گی ۔ میں سارا کام خود کروں گی ۔

میری امّی! تم نہیں جانتیں . . . . مگر تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری زاہدہ اس وقت نی آزردہ بیٹھی ہے ۔

لیکن کیا پتہ ۔ اختر ستمبر میں کوشش کر ہی دے ۔ آتی دفعہ اس نے مجھے کتنی زیادہ لی نہیں دی تھی ۔ میں ہی پاگل ہوں جو یوں سوچتی ہوں ۔ میں تو خواہ مخواہ رونے لگ ی تھی ۔ اب نہیں روؤں گی ۔ اور ستمبر کا انتہائی صبر اور حوصلے سے انتظار کروں گی ۔

دادا جان شادی کی بات پکی کریں گے ۔ تو میں اسے کسی نہ کسی طرح ٹال دوں گی ۔

اچھے خدا! تم میری مدد کرنا ۔ ضرور کرنا ۔

دن گزر رہے ہیں ۔ صبح ہوتی ہے اور شام ہو جاتی ہے ۔ رات ہوتی ہے پھر صبح ہو جاتی ہے ۔ کئی روز گزر گئے ہیں ۔ اختر کو پچیس روز ہو گئے ہیں ۔ اس نے کوئی خط بھی نہیں لکھا ۔ مگر وہ لکھ بھی کیسے سکتا تھا! . . . . ہمارے گھر میں تو خط آ ہی ں سکتا ۔ اگر کوئی ڈاکیا میرے نام کا خط لے کر آ جائے ۔ چاہے وہ میری کسی سہیلی نے کیوں نہ لکھا ہو ۔ تو میری تو شامت ہی آ جائے . . . . دادا جان یہ کبھی پسند نہیں تے کہ میں کسی سہیلی سے ملوں ۔ یا خط و کتابت کروں ۔ اور پھر ہمسائے بھی تو طرح طرح باتیں کرتے ہیں ۔

ہمارے گھروں میں یہ کیسی بری عادتیں ہیں ۔ لیکن ان کو کیسے دور کروں . . . . یہاں دور دور تک جاہل لوگ رہتے ہیں ۔ ذرا ذرا سی بات پہ لڑتے ہیں ۔ کل شمیم کی والدہ شمیم کی دادی میں بہو اور ساس میں جھگڑا شروع ہوا ۔ تو اس جھگڑے کے سلسلے تین

اور گھروں تک بھی جا پہنچے ۔ اور پھر باقاعدہ ایک لڑائی شروع ہو گئی ۔

ایک کہے تھے بات کرتے بھی شرم نہیں آتی ۔ تیری بیٹی کونسی کنواری بیاہی گئی تھی ۔ حرام کا لڑکا پیدا کر کے ہی سسرال پہنچی تھی ۔ پھر بھی تو گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتی اور وہ کہے تیری منور بھی ایک نہیں کئی حرام کے بچے پیدا کرے گی ۔ روز وہ یار سے ملنے جاتی ہے اچھی طرح تیری ناک کاٹے گی ۔

یا خدا! .... ایسی ایسی فحش باتیں کر رہی تھیں کہ سنی نہیں جا رہی تھیں ۔

اور ماں یہ سن کر منور کو پیٹ رہی تھی ۔ کہ نامراد! نہ تو پیدا ہوتی نہ تیرے یار کا طعنہ مجھے ملتا ۔

یہاں تو روزانہ ہی کچھ ہوتا ہے ۔ روز جھگڑے ہوتے ہیں ۔ چیختی ہیں ۔ چلاتی ہیں رات کو خاوند اور بیٹے گھر آتے ہیں تو رو رو کر ان کو سناتی ہیں .... پھر اس نے جس جس کو ڈانٹنا ہوتا ہے ۔ ڈانٹتا ہے ۔ اور رات گئے تک بڑبڑ ہوتی رہتی ہے ۔ صبح کو پھر وہ سلسلہ چلتا ہے ۔

میں ایسی باتیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہتی ہوں کہ یہ دنیا میں کاہے کے لیے آئی! دنیا میں آنے کا ان کا مقصد کیا ہے ۔

یا خدا! تو مجھے اس ماحول سے کب نکالے گا ۔ میرے لیے یہ ماحول اتنا اجنبی کیوں ہے ۔ کب تک اجنبی رہے گا ——!!

آج میں اختر کو خط لکھوں گی ۔ مگر پوسٹ کیسے کروں گی ——!!

اچھا کل انجم کے ساتھ بازار جاؤں گی ۔ تو راستے میں پوسٹ کر دوں گی ۔ خدا کرے! خط اختر کو مل جائے ۔ ایڈریس تو اُس نے ٹھیک ہی دیا ہو گا ۔

آج کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر خط لکھوں گی ۔ سب سے چھپ کر ۔ اور کہیں دادا جان کو پتہ چل جائے ۔ تو گھر کو آگ ہی لگا دیں گے ۔

میں اختر کو بتاؤں گی کہ میں اسے کتنا زیادہ یاد نہیں کرتی میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور اسے کہوں گی کہ تم جلدی جلدی آجاؤ ۔

اختر کو تین خط ڈال چکی ہوں ۔ آج اختر کو گئے دو مہینے ہو گئے ہیں ۔ ۱۵ ستمبر تک اس نے آنے کا وعدہ کیا ہوا ہے ۔ ۲۰ روز باقی رہ گئے ہیں ۔ یا خدا! یہ بھی جلدی گزر جائیں تو اچھا ہے ۔ اختر نے تصویر دینے کا وعدہ کیا تھا ۔ وہ بھی نہیں دی ۔ اچھا دن گزر ہی جائیں گے ۔ کسی نہ کسی طرح ۔

اختر کو میں چھ خط لکھ کر ڈال چکی ہوں ۔ لیکن یہ نہیں پتہ کہ اسے ملتے بھی ہیں ۔ یا نہیں ۔ اب یہ تو اس کے آنے پر پتہ چلے گا ۔ اس کے آنے میں اب کون سے دن رہ گئے ہیں ۔ صرف چار دن باقی رہ گئے ہیں ۔

نہ جانے اختر اب کیسا ہو گا؟ ...... ضرور موٹا ہو گیا ہو گا!

ہم تو اس سڑی گرمی میں کس مشکل سے دن گزارتے رہے ہیں ۔ اس دفعہ تو برسات بھی نہیں ہوئی ۔ گرمیوں کا یہ موسم کتنا بُرا موسم ہے ۔ کل رات کس قدر آندھی آئی تھی ۔ دنیا میں سب سے زیادہ اگر مجھے کوئی چیز بری لگتی ہے ۔ تو وہ صرف آندھی ہی ہے ۔ آندھی چل رہی ہو تو کوٹھوں پر سے چیزیں اتارتے ہوئے لوگ بھوت لگتے ہیں ۔ آندھی ہر چیز کو خاک میں ملا کر رکھ دیتی ہے ۔ کہتے ہیں جس چیز سے انسان کو نفرت ہو ۔ اکثر وہی چیز اس کا مقدر بن جاتی ہے ۔ ..... آندھی سے مجھے نفرت ہے ۔

کہیں میری زندگی میں بھی کوئی ایسی آندھی نہ چل جائے ۔ جو میری زندگی، میری اداؤں اور میری جوانی کو خاک میں ملا کر رکھ دے!

یا خدا! ایسا کبھی نہ کرنا ۔ کبھی نہ کرنا ۔

کئی روز سے ڈائری نہیں لکھ سکی۔ بہت بخار آتا رہا۔۔۔۔۔۔ رات کو
سردی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ آسمان سے ساری رات شبنم گرتی رہتی
ہے۔ اور میں معمولی سی چادر اوڑھ کر سوتی رہتی ہوں۔ جس سے سردی لگ
کر بخار ہو گیا ہے۔

اختر ابھی تک کوہ مری سے نہیں آیا۔۔۔۔۔

اکتوبر کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ خدا جانے اب وہ واپس بھی آئے گا یا
نہیں۔

دادا جان نے کالج داخل نہیں ہونے دیا۔۔۔۔۔ سارا سارا وقت روتی رہتی
ہوں۔ زندگی میں کیا دلچسپی رہ گئی ہے۔ لیکن دلچسپی پیدا ہی کب ہوئی تھی؟ دلچسپی کے بغیر
زندگی نہیں گزر سکتی۔ ہماری زندگی تو ایک ویران اور کالی رات ہے جس میں چند لمحے
جگمگائے تھے۔ اور خدا جانے رات کو اسی تاریکی میں وہ کہاں کھو گئے ہیں۔
آسمانوں کی سمت اڑ گئے ہیں؟

میری ساری سہیلیاں کالج میں داخل ہو گئی ہیں۔ زندگی ان کے لیے ایک ایسا باغ
ہے۔ جسے بہار اپنے دامن میں پروان چڑھا رہی ہے۔ مگر میرے لیے زندگی ایک
ویران باغ ہے۔ ہر درخت پتوں سے خالی ہے۔۔۔۔۔ شاید کبھی یہاں
بہار آجائے!

آج وہ لوگ شادی کا رشتہ لے کر ہمارے گھر آئے تھے۔ وہی لوگ جہاں پر
دادا جان شادی کرنا چاہتے ہیں۔ دادا جان نے کہا ہے میں ایک ماہ کے بعد بتاؤں
گا کہ میں زاہدہ کی شادی کر دوں گا۔۔۔۔ یا نہیں۔۔۔۔۔

ان عورتوں نے مجھے بھی دیکھا۔ ان کا خیال ہو گا شاید میں شرماؤں گی۔۔۔۔۔ اور
مسکراؤں گی اور گھونگھٹ نکال لوں گی۔

لیکن میں خاموش۔ اداس اور زرد چہرہ لیے ان کے سامنے چپ چاپ بیٹھی رہی۔۔
۔۔۔ میں ان کو کیا کہتی!!

کتنی موٹی۔ بے ڈھنگی عورتیں آئیں تھیں!۔۔۔۔ ایک نے اگر کس کر چٹیا کی ہوئی
تھی تو دوسری نے یوں جوڑا کیا ہوا تھا۔ جیسے کیلوں سے ٹنگا ہوتا ہے۔ سروں پر بے تحاشا تیل
لگایا ہوا تھا۔۔۔۔ ایک نے گلابی شلوار۔ فیروزی قمیض اور کیسری دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ دوسری
نے مونگیا رنگ کا سوٹ اور سرخ رنگ کا دوپٹہ۔

واہ! واہ کیا میچ کیا ہوا تھا! سبحان اللہ۔۔۔۔ جن کو رنگوں کا ٹیسٹ نہیں۔ ان کے
دماغ میں تو گھاس بھی نہیں کیا بھرا ہوگا۔۔۔۔

کیا میں ان لوگوں کے درمیان رہ سکتی ہوں!۔۔۔۔ نہیں نہیں کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی
نہیں ہو سکتا۔ میں زہر کھا لوں گی۔ خودکشی کر لوں گی۔ مگر یہ شادی نہ کروں گی۔

ان کے جانے کے بعد میں نے امی سے کہا۔۔۔۔ امی!

یہ کس چڑیا گھر سے جانور آئے تھے!!۔۔۔۔ کس میلے میں گھومنے گئے تھے۔

امی! ان کو کہنا . . . . . یہاں پھر کبھی نہ آئیں ۔ اور امی ہنس دیں کہ پگلی! تو تو یونہی مذاق کرتی ہے! تو پڑھ لکھ گئی ہے ۔ مگر ان کو تو کہیں اسکول میں نہیں پڑھایا گیا نا . . . . . یہ بیچاری سیدھی سادھی ہیں ۔

تو امی! ان سیدھی سادھیوں کو پھر سیدھے سادھے گھر میں جانا چاہیئے ۔ اتنے میں دادا جان آگئے اور میں خاموش ہوگئی ۔

آج کا دن میری زندگی میں خوب صورت ترین دن طلوع ہوا تھا آج کی صبح کتنی حسین تھی! آج کی صبح نے اس اہتمام سے آسمان کے مشرقی کناروں سے اپنا چہرہ ادھر اُٹھایا کہ یوں لگا تھا جیسے ایک نہیں دو سورج طلوع ہوئے ہیں۔ آج اختر کوہ مری سے واپس آگیا تھا۔ اور آتے ہی اس نے کہلا بھیجا تھا کہ جس طرح بھی ہو تم ابھی ملنے آؤ۔ میں تمہارے بغیر بہت اداس ہوں ۔ آج میں کتنی خوش تھی! . . . . .

میرے انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی ۔

کاش! آج کا دن ہمیشہ میری زندگی پر چھایا رہتا ۔ آج کے دن کی شام کبھی نہ ہوتی ۔ آج کا دن اتنی جلدی کیوں غروب ہوگیا!

ہائے! جب آج میں اختر سے ملی ۔ تو میرے لیے وہ لمحہ کس قدر سہانا . . . . . کیسا لافانی، اور کیسا انمول لمحہ نہ تھا ۔

اے زندگی کے حسین ترین لمحے! تو کب سے میری انتظار میں بیٹھا تھا! . . . . . کیا تو مجھے

بار بار نہیں ملے گا؟

اختر کس قدر موٹا اور سرخ ہو رہا تھا . . . . . اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ نشیلی ہوگئی ہیں . . . . . جب وہ میری طرف پیار سے دیکھتا ہے تو میری دنیا ڈولنے لگتی ہے

مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا ۔ کہنے لگا تمہیں کیا ہوگیا ہے ۔ تم اتنی کمزور اور زرد سی نظر آرہی ہو ۔ میں نے یہ سن کر رونا شروع کر دیا ۔ میں اسے کیا کہتی!! . . . .

میں اسے کیا بتاتی . . . . . کہ تیری جدائی نے میرا یہ حال کر دیا ہے ۔ یہ صرف تیری ہی جدائی ہوگی ۔ جو مجھے موت سے ہم آغوش کرے گی ۔ اور تیرا ہی ملاپ ہوگا ۔ جو مجھے زندگی بخشے گا ۔

پھر میں اور اختر بہت دیر باتیں کرتے رہے اختر اپنی سیر کے واقعات سناتا رہا . . . .
کہنے لگا ۔ وہاں مال روڈ پر شام کو اس قدر رونق ہوتی ہے کہ میں بتا نہیں سکتا ۔
اس دفعہ کوہ مری اتنی خوبصورت خوبصورت لڑکیوں سے بھری ہوئی تھی ۔ کہ میں بتا نہیں سکتا ۔

اس کی یہ بات سن کر نہ جانے کیوں میرا دل اداس ہوگیا . . . .

اختر کو کسی اور لڑکی کا ذکر کرتے یا اسے خوبصورت کہنے کا کیا حق حاصل ہے! مگر میں خاموش رہی ۔

پھر وہ کہنے لگا ۔ ایک لڑکی زرینہ روزانہ مجھے وہاں مال روڈ پر سیر کرتی مل جاتی تھی اور پھر وہ مجھ سے باتیں بھی کرنے لگی ۔ ہمارے گھر بھی آنے جانے لگی ۔

مگر میں نے اس کی کبھی پرواہ نہ کی ۔ میں تو صرف تمہیں یاد کرتا رہا ۔ صرف تمہیں کہ اگر تم بھی یہاں ہوتیں ۔ میرے ساتھ پہاڑ پر آئی ہوتیں ۔ تو ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سیر کرتے ۔ پھر کتنا مزہ آتا ۔

اور میرا دل جو زرینہ کی بات سن کر بجھ رہا تھا ۔ پھر سے چمک اٹھا ۔ اور میں بہت خوش ہوگئی ۔ اختر پر مجھے پورا یقین ہوگیا . . . . .
پورا پورا یقین ۔ کہ وہ مجھے بے انتہا چاہتا ہے ۔

میں نے اختر سے کہا - اگر تم چاہتے - تو تم مجھے ساتھ لے جا سکتے تھے ۔

وہ کیسے زاہدہ ؟

کیا تم نہیں سمجھے ؟

اچھا تو پھر سہی !

اچھا - تو پھر اگلے سال سہی - یہی ترکیب پھر بھی چل سکتی ہے - پھر میں نے بھی اختر کو اپنی باتیں بتائیں - کہ اس کے بغیر میری زندگی کے دن کیسے گزرے - اسے بتاتے وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے - اور اختر کہنے لگا -

تم بالکل بچہ ہو - ذرہ ذرہ سی بات پہ رونے لگ جاتی ہو !

پھر اختر نے پوچھا - کالج داخل ہو گئی ہو ؟

میں نے کہا - بالکل نہیں ہوئی ..... اور نہ ہو سکتی ہوں - دادا جان تو اگلے ماہ میری شادی کر رہے ہیں ۔

اختر نے بڑے افسوس کا اظہار کیا - مگر وعدہ کیا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور مدد کرے گا - اس نے بتایا کہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا - اور یہ کہ اس نے مجھے اپنے سینے سے ساتھ لگا لیا - اس کے سینے کے ساتھ لگتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں اور مجھے یوں لگا جیسے میں جادو کی مدد سے جنت میں داخل ہو گئی ہوں - اس کے چوڑے سینے پہ سر رکھ کر میں زندگی بھر تک سوئی رہنا چاہتی تھی ۔

اس کے گریبان کے پاس سے بہت اعلیٰ سینٹ کی خوشبو آ رہی تھی - پھر

اختر مجھے بہت پیار کرتا رہا .....

لیکن بار بار ایک خیال آتا تھا کہ جہاں جدائی نے مجھے اداس اور زرد کر دیا تھا وہاں اختر کو جدائی نے کتنا سرخ اور موٹا کر دیا تھا ۔

کیا اختر کو جدائی راس آ گئی تھی ؟ .....

مگر نہیں نہیں .....

مجھے ایسے شک اور وہم کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہیے - یہ وہم اور

شک محبت کو قتل کر دیتے ہیں ۔

میں نے شروع دن سے ہی اس کی بات پر یقین کر لیا تھا اور ہمیشہ اس کی باتوں پر ایمان لاؤں گی - وہ کبھی جھوٹا اختر ثابت نہیں ہو گا ۔

گھر آتے ہی دادا جان سے جھڑکیاں پڑیں مگر آج ان کی جھڑکیوں کی کون پرواہ کرتا تھا ۔

آج میری پرانی سہیلی نجمہ نے مجھے خط لکھا - نجمہ کتنی مہربان اور اچھی لڑکی ہے ! اور خط کے ساتھ اس نے مجھے ایک جوڑا بھی بھیجا ہے - میں لینا نہیں چاہتی تھی - مگر اس نے کتنے پیار اور اصرار سے بھیجا تھا ! ......

جوڑا کتنا پیارا ہے ! امی کہتی ہے - جہیز کے لیے رہنے دو - مگر میں تو اسے پہن لوں گی ۔

میں اسے پہن کر اختر کے پاس جاؤں گی .... آسیہ کراچی سے آئی ہی نہیں ، بلکہ وہاں سے کوئٹہ چلی گئی تھی - اور اب وہ سکول بھی نہیں آئے گی - لیکن مجھے اب اسکول سے کیا ۔

لیکن آج دادا جان سے کہوں گی - رات رو رو کر ان کو مناؤں گی کہ مجھے کالج میں داخل کرا دیں - اختر نے تو کوئی بھی نہیں کہلا بھیجا ۔

وہ بچارا کہے بھی کیسے ؟ دادا جان تو ایک پل میں عزت اتار کر رکھ دیتے ہیں ۔

پھر کیا ہوا - اگر اختر نے وعدہ کرنے کے باوجود کسی کو نہیں بھیجا میں اس سے بات پر کبھی خفا نہیں ہوں گی - اختر جو کچھ بھی ہے اچھا ہے یا برا - اب تو میرے خوشی میری زندگی کا خون اور میرے سر کا تاج ہے - اگر وہ مجھ سے پیار کرتا ہے میرے لیے یہ سارا کچھ ہے - اور وہ یقیناً مجھ سے پیار کرتا ہے ۔

ایک ماہ گزر گیا ہے۔ دادا جان نے میری وہاں بات پکی کر دی ہے۔ اور کہا ہے کہ شادی بھی جلدی کر دیں گے۔

ہائے! میں کیا کروں گی۔ میں نے تین روز سے روٹی بھی نہیں کھائی۔ بھوک ہڑتال شروع کی ہوئی ہے۔ رو رو کر پاگل ہو رہی ہوں مگر میری بات کوئی نہیں مانتا۔ امی بھی خاموش ہیں۔ امی کو کیا پتہ کہ یہ شادی نہیں بلکہ اس کی بیٹی کی موت ہوگی۔ دادا جان بھی نہیں سن رہے۔

وہ تو بالکل ہی پاگل ہو گئے ہیں۔ . . . کیا انہوں نے اپنی شادی کرنی ہے۔ یا خدا میری مدد کرنا۔ میں تو نہ راتوں کو سو سکی ہوں نہ کچھ کھایا ہے۔

ہائے! میں کیا کروں گی!

اختر کو بھی کچھ خیال نہیں ہے!

میں ایک دو روز تک اختر کو جا کر ضرور کہوں گی۔ ضرور کہوں گی کہ کیا وہ میرے ساتھ فریب تو نہیں کر رہا! میرے دل میں شک آ رہے ہیں . . . . .

لیکن نہیں، جب تک اس کو دیکھ نہ لوں گی۔ شک کو پاس نہ آنے دوں گی۔ میں اس سے آخری بات پوچھ کر آؤں گی۔

ہائے! مجھے بار بار شادی کا کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہے مگر اختر کو کوئی خیال ہے۔ اچھا۔ میں اب بالکل آخری دفعہ اختر سے کہوں گی۔ کہ اگر اب اس نے اپنی کوشش نہ کی تو پھر میں اس سے ملنے کبھی نہ آسکوں گی۔

پھر میری زندگی کے سارے گیت ختم ہو جائیں گے۔ ہر آواز خاموش ہو جائے گی۔
میرے آسمان پر سے ہر تارا ٹوٹ کر کہیں گم ہو جائے گا۔
اور سارا آسمان تاریک ہو جائے گا۔ میری دنیا اندھیری ہو جائے گی۔ نہ کوئی سورج چمکے گا . . . . اور نہ کوئی چاند مسکرائے گا۔
میں اسے سارا کچھ بتا دوں گی . . . . ضرور بتا دوں گی۔

آہ! ابھی اس بہار کا پہلا پھول بھی نہیں کھلا تھا۔ اور ابھی کسی بلبل نے بھی ٹہنیوں پر بیٹھ کر کوئی بھی رسیلا گیت نہیں گایا تھا۔ کہ خزاں کی زرد آندھی چھا گئی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ کیا ہو گیا ہے! میرے کسی دشمن نے میری شکایت لگا دی ہے؟

آہ! دادا جان اور امی کو کسی نے آن کر میری اور اختر کی دوستی کی تمام باتیں بتا دی ہیں اور میں نے جو خط اختر کو لکھے تھے۔ اس کا بھی بتا دیا ہے۔ آہ! ایسا میرا کون دشمن تھا جس نے اسکا کیا بگاڑا تھا!۔

امی نے مجھے کچھ نہیں کہا ہے۔ بالکل کچھ نہیں۔ مگر ان کے آنسو نہیں تھمتے۔ میں ان کو بہتیرا یقین دلاتی ہوں۔ کہ امی! یہ سارا کچھ جھوٹ ہے۔ بالکل جھوٹ ہے۔

اور انہوں نے مان بھی لیا ہے کہ یہ سارا کچھ جھوٹ ہی ہوگا۔ مگر وہ میری قسمت پر رو رہی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں وہ رو رہی ہیں۔

اور دادا جان نے تو مجھے اتنا مارا ہے اور گالیاں دی ہیں کہ بتا نہیں سکتی۔ نہ دو روز سے گھر میں کچھ پکا ہے۔ دادا جان کہتے ہیں۔ اس کی ڈولی یا جنازہ گھر سے نکال کر ہی اب یہاں چولہا گرم کروں گا . . . . میرے خدا! یہ کیا ہو گیا ہے! مگر یہ بتایا کس نے ہے۔

کیا اختر کے گھر والوں میں سے کسی نے بتایا ہے! لیکن اور کون بتا سکتا ہے! اور تو کسی کو
علم نہیں! مجھے جس بات کا ڈر تھا۔ وہ ہو گیا ہے۔

اب کیا ہو گیا۔

اختر! کیا تمہارے گھر والے اس قدر بے رحم اور ظالم ہیں! میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا!.....

اختر! میں نے تو تم سے بھی کچھ نہیں چاہا تھا...... تم سے صرف محبت ہی کی تھی نا.....
اس ایک سال کے عرصہ میں صرف تم سے محبت ہی کی ہے نا..... اور تو تم سے
کچھ نہیں چاہا۔ میں نے تم سے کچھ لیا تو نہیں نا..... بلکہ دینا ہی چاہا ہے نا..... پھر ایسا
کیوں ہو گیا؟

کیا تم نہیں جانتے تھے کہ ہم لڑکیاں..... ہم جیسے ماحول کی لڑکیاں..... کسی سے
یوں محبت نہیں کر سکتیں۔ وہ اگر کسی لڑکے سے محبت کرتی ہیں تو اسکو اپنا خاوند سمجھ کر کرتی ہیں
ہم محبت کہیں اور شادی کہیں اور نہیں کر سکتیں۔

نہ ہم محض دوستی رکھ سکتی ہیں..... پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں کہیں اور شادی
کر لوں۔

میرا تو اب کسی اور شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں تو پاگل ہو
جاؤں گی۔

اختر لوٹ آؤ نا! میں کیا کروں گی! میں تمہیں کیسے بھلا دوں۔

تمہیں بھلانا میرے اختیار سے باہر ہے۔

میں اب تو تمہیں مل بھی نہیں سکتی۔ ورنہ میں تمہیں سارا کچھ بتاتی۔ کاش! میری مہربان سہیلی
نجمہ یہاں ہوتی۔ تو میں اسے سارا کچھ بتاتی۔ مگر وہ اتنی دور سیلون بیٹھی ہے۔

اب کیا ہو گا! سوچ سوچ کر میرا تو سر پھٹنے لگا ہے۔

زندگی دکھوں اور غموں سے بھری ہوئی ایک ایسی طویل اور سیاہ رات نظر آتی
ہے۔ جس کی صبح قیامت تک بھی ہوتی نظر نہیں آتی.....

اس زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا۔ جو خوشی کا ہو..... بے وفا اختر! دو ماہ
گئے ہیں اس سے ملے ہوئے۔ مگر اس نے بھول کر بھی خبر نہیں لی..... مجھے کبھی خیال
نہیں آیا تھا کہ اختر ایسا بھی بے وفا ہو سکتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کی باتوں پر یقین کیا تھا
ہ جھوٹا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن کیا پتہ۔ یہ اس ہی کی شرارت نہ ہو۔

وہ تو کہتا تھا میں تم سے محبت کرتا ہوں..... پھر وہ شرارت کیسے کر
سکتا تھا!.....

کل شام دادا جان گجرات جا رہے ہیں..... ان کے جانے کے بعد میں ایک
ر خود بھی اختر سے ملوں گی۔ ضرور ملوں گی۔

پھر اس کے بعد جو ہو گا۔ دیکھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ میں خودکشی
ر لوں گی..... میں نیلا تھوتھا کھا لوں گی..... اور مر جاؤں گی۔ مجھ کو بھلا زندہ
کر کیا کرنا ہے!

لیکن میری بہن اور میرے بھائی اور میری ماں کا کیا بنے گا! میری ماں تو یہ صدمہ
لا نہ سہہ سکے گی؟ زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ چند ماہ تک میری شادی ہو جائے گی...
ر! میں شادی کیسے کر سکتی ہوں! مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جہاں یہ میری شادی
نا چاہتے ہیں۔

میں اختر کے سوا کسی سے شادی نہیں کر سکتی! لیکن اگر میری شادی اختر سے نہیں ہو سکتی۔ تو پھر میں کسی سے بھی نہیں کروں گی۔

پھر میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گی۔ لیکن یا خدا! اس دادا جان کو تو ہی سمجھا میں کس کے آگے فریاد کروں!!

کل سے بارش ہو رہی ہے۔ سردیوں کی ٹھنڈی اور تیز بارش!
دادا جان کو گجرات جانا تھا۔ مگر نہیں گئے۔ اب بارش تھمے گی تو پھر جائیں گے۔ ایک ایک لمحہ گن گن کر گزار رہی ہوں۔
یوں لگتا ہے۔ . . . . جیسے یونہی جلتے جلتے مر جاؤں گی۔ بس ایک بار اختر سے ملنے اور مل کر ساری باتیں کرنے کی حسرت ہے۔ وہ پوری ہوئے تو پھر مر جاؤں گی۔ مجھ کو زندہ رہ کر کیا کرنا ہے!

دات دادا جان گجرات چلے گئے ہیں۔ آج میں اختر سے ملنے گئی۔ ان کے گھر میں کافی چہل پہل نظر آتی تھی۔ مہمان وغیرہ آئے ہوئے تھے۔ میں نے واپس آنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر پھر سوچا کہ شاید پھر نہ آ سکوں آج ہی بات کر کے جاؤں۔
اختر کے کمرہ کا دروازہ کھلا تھا میں اندر جا کر بیٹھ گئی اور کمرہ کو دیکھنے لگی۔ مجھے پچھلے سارے دن یاد آ گئے۔ اور سارے دنوں کے ساتھ ہی آنکھوں میں بے شمار آنسو آ گئے۔ اتنے آنسو جو بہے بغیر نہ رہ سکے۔ میرا دل بھر آیا۔ اور میں نے سسکیاں بھر بھر کر رونا شروع کر دیا۔

پھر ایک دم خیال آیا کہ اگر کوئی اور آ گیا۔ تو! اور میں نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالنا شروع کر دیا کہ کچھ بھی تو نہیں ہوا کہ میں خواہ مخواہ پاگل ہو رہی ہوں۔
اتنے میں اختر آ گیا . . . . مجھے دیکھ کر بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا . . . . . .

اس کے لپٹنے کی دیر تھی۔ کہ آنسوؤں کا سیلاب سارے بند توڑ کر بہہ نکلا . . . . . اور پھر میں اس قدر روئی کہ اس کی قمیض گریبان کے پاس سے تر ہو گئی۔ اور وہ خاموش رہا۔
باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تو وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور میں بھی درست ہو کر بیٹھ گئی۔ آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ میں نے رومال سے خشک کر کے منہ پرلی طرف کر لیا۔ لیکن کوئی بھی ادھر نہ آیا۔ بلکہ سیدھا اوپر چڑھ گیا۔ اختر نے اٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ اور پھر پاس کی کرسی پر آن بیٹھا۔
زاہدہ! کیا مجھ سے خفا ہو۔
میں خاموش رہی۔
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں بات کیسے شروع کروں۔
میں پھر بھی خاموش رہی۔
کیا مجھ سے بولو گی نہیں۔
میں پھر بھی چپ رہی۔
پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جھنجوڑا۔
زاہدہ! زاہدہ! کچھ تو بات کرو نا۔ دیکھو تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے۔
میں چپ تھی۔
زاہدہ! تمہیں میری جان کی قسم! کچھ تو بات کرو۔
مگر مجھ سے بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے مجھ سے قوت گویائی ہی چھین لی ہے۔ ہونٹ کھولنے کی بھی سکت نہیں تھی۔
پھر وہ اٹھ کر میرے پاس آ گیا اور میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔
میں جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اور کہا:۔
تمہیں اب کوئی حق حاصل نہیں۔ کہ تم مجھے یوں پیار کرو۔
کیوں؟

یہ اپنے دل سے پوچھو۔ یا ان لوگوں سے پوچھو۔ جنہوں نے میرے گھر میں چنگیاں لگائی تھیں۔ اختر!...... تم مجھے یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا مگر تمہیں ایسا رویہ کبھی اختیار نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

تم نے میرا جینا اجیرن کر دیا ہے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تمہارے کارن ہمارے گھر میں جو کچھ ہوا ہے۔ وہ تمہیں میں کبھی نہ بتا سکوں گی۔ نہ تمہیں اس کا احساس ہو سکتا ہے ہماری زندگی تو پہلے ہی دکھوں سے بھری ہوئی تھی اختر! پھر تم لوگوں نے ایسا ظلم کیوں کیا اختر!

مگر اختر نے قسم کھائی۔ کہ اسے اس واقعے کا کچھ علم نہیں ہے نہ اس کے گھر والے ایسے ہو سکتے ہیں۔

لیکن میرے دل کو یقین نہ آیا۔ بھلا ان لوگوں کے سوا اور کسی کو کیا علم تھا۔

لیکن میں چپ ہو گئی۔

کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اختر نے بتایا کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اور واقعی محبت کرتا ہے۔ لیکن شادی کرنا اس کے متعلق وہ اب کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اس نے گھر میں بہت زور لگایا تھا۔ مگر اس کی امی کسی طرح نہیں مان رہیں۔ وہ اپنی بھتیجی ثمینہ کے ساتھ میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔

اختر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا......

موت کا سا سناٹا چھا گیا......

مجھے اختر کے اس جواب کی ہرگز ہرگز توقع نہ تھی۔ میرا دل اتنی شدت سے دھڑکا جیسے ابھی رک جائے گا۔

پھر کچھ دیر تک میں وہاں بیٹھی رہی۔ اور پھر اٹھ کر آنے لگی۔ اختر نے واسطے دے کر کہا۔ کہ خدا کے لیے حوصلے اور صبر سے کام لینا۔ اور ملنے ضرور آیا کرنا۔ میں مجبور ہو گیا ہوں۔ وعدہ کرو ملنے آؤ گی۔

دیکھو...... غم نہ کھانا۔

خدا کو اسی طرح منظور تھا۔ مجھ سے اس سے آگے کچھ نہ سنا گیا...... مجھے اپنے چاروں طرف یاں چلتی نظر آئیں۔ اور میں نہ جانے کس مشکل سے واپس چل کر گھر آئی۔ اور پھر یوں میں ہی چکر کھا کر جو گری تو بعد کی ہوش نہ رہی۔

آج کئی روز کے بعد ہوش آئی ہے۔ سارا جسم درد سے چور چور ہو گیا ہے سیڑھیوں پر جب گری تھی۔ تو نیچے پانی کا گھڑا پڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ جا کر ٹکرائی...... ماتھا اور آنکھ کے قریب سے جگہ پھٹ گئی۔ کانوں سے خون بہنے لگا۔ بازو کے قریب شدید چوٹیں آئیں۔ بہت برا حال ہوا۔

امی سارا وقت روتی رہتی ہیں...... سوچنے اور سمجھنے کی ہر قوت جیسے جواب دے گئی ہے۔

کئی روز کے بعد آج بستر سے نیچے اتری۔ آئینہ میں چہرہ دیکھا۔ تو ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ آج میں نے اپنا بستر اوپر دھوپ میں لگوایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

آسمان گہرا نیلا ہو رہا تھا۔ اور بڑی ہی پیاری اور سنہری دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ دن بڑا ہی روشن تھا۔

یہ سماں دیکھ کر نہ جانے کیا خیال جی میں آیا کہ سارا جسم لرز اٹھا۔ اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ آنسو یوں نا معلوم آواز میں گرتے رہے کہ پونچھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی......

ایک دم دل میں خیال آ گیا......

میں کیا تھی؟ میں نے کہاں سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ اور میں کہاں آ گئی ہوں!!

. . . . . میری سہیلیاں ہنسی خوشی کالج جاتی ہوں گی ۔ اختر بھی بہت خوش خوش زندگی
رہا ہوگا ۔ اس کو مجھ سے کیا ؟

اس نے تو محض کھیل کھیلا تھا ۔

کسی کا کچھ نہیں بگڑا . . . . . اگر زندگی تباہ ہوئی ہے تو صرف میری . . . . .

ماں جانتی ہے کہ مجھے کوئی روگ اندر ہی اندر کھا رہا ہے ۔ اور اس خیال سے
ان کی جان بھی گھل رہی ہے ۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتیں ۔ دادا جان میری شادی کرنا چاہتے
ہیں ۔ وہ لوگ میری عیادت کو آئے تھے ۔

نیچے پھوپھی نے نہ جانے ان کو کیا سکھلایا ہے ۔ کہ وہ منہ پھلا کر یہاں بیٹھی رہیں
اور پھر چلی گئیں ۔ اللہ کرے ! اب کبھی نہ آئیں ۔

سمجھ میں نہیں آتا ۔ زندگی کیسے بسر ہوگی ؟ کیا ہوگا ؟

نسیمہ میرا کس قدر خیال رکھتی ہے ! بچاری ننھے ننھے ہاتھوں سے میرا
سر دبا دباتی ہے ۔ کہتی ہے ۔ باجی ! آپ کب اچھی ہوں گی ! آپ کو ایسا چکر آچکا
کیسے آگیا کہ آپ ساری سیڑھیاں ہی گر پڑیں . . . . .

میری بہن نسیمہ ! میری چھوٹی سی گڑیا ! تمہیں کیا پتہ . . . . . میں کہاں
سے گری ہوں ؟

تو تو صرف سیڑھیوں پر سے کہہ رہی ہے ۔ میں تو اپنی زندگی کی بلند ترین چوٹی
پر سے گری ہوں ۔ اور ایسی گری ہوں کہ اب کبھی نہ اٹھ سکوں گی . . . . یہ سیڑھیوں
کی چوٹ تو چند روز کے بعد بالکل ٹھیک ہو جائے گی ۔ مگر میرے دل پر جو چوٹ
لگ چکی ہے اور جو زخم لگ گیا ہے ۔ وہ دن بدن پھیلے گا ۔ ناسور بنے گا ۔
اس کو کبھی آرام نہ آئے گا ۔ یہ زخم کبھی مندمل نہ ہوگا ۔ یہ تو میری زندگی کی بنیاد
تک کو ہلا کر رکھ دے گا ۔

یہ مجھے قبر میں اتار کر دم لے گا ۔ یہ نہ جانے اور کس کس کو اپنی لپیٹ میں
لے ۔ تُو تو ابھی معصوم ہے ۔

کبھی میں بھی معصوم تھی ۔ تم جیسی ایک چھوٹی سی پیاری لڑکی تھی . . . . .
اب ! . . . . .
اب تو نہیں جان سکتی . . . . . نہ خدا کرے تو کبھی جانے !
پھوپھی کے لڑکے نے آج چھٹی لی ہوئی ہے ۔ ریڈیو لگا کر کمرہ میں بیٹھا
ہے ۔

ریڈیو پہ ریکارڈ لگا ہوا ہے ۔

دل آہ بھر ایسی ۔ کہ میری جان جلا دے

خورشید گا رہی ہے ۔

اے میرے دل ! تو بھی ایسی آہ بھر ۔ کہ میری جان جلا کر راکھ کر دے !

زندگی کا کوئی مقصد سامنے نہیں رہا ۔ اور بلا مقصد زندگی بسر کرنا کس قدر مشکل
کام ہے ۔

سارا سارا دن اوپر چھت پر دھوپ میں لیٹی رہتی ہوں ۔ چہرے کا رنگ سیاہ ہی
رہا ہے ۔ کبھی آسمان کو تکتی رہتی ہوں اور کبھی دیوار سے اکھڑی ہوئی پلستر کو گھورتی رہتی ہوں
کاش ! میں کالج داخل ہو جاتی . . . . . تو میرا جی کس قدر نہ لگ جاتا . . . . . کچھ تو
جاتا . . . . . سہیلیوں میں اور پڑھائی میں محو ہو کر میں اختر کے بخشے ہوئے غم کو بھول جاتی
کیا کروں ! سارا وقت صرف اسی کا خیال دل میں سمایا رہتا ہے ۔ اور مجھے رلاتا رہتا

اختر نے مجھے کئی بار بلا بھیجا ہے ۔ مگر میں نہیں گئی ۔ میں نے اب کیا جا کر کرنا ہے !
آج بھی ہوا اپنا جی لگاؤں گی ۔ میں اسے بتاؤں گی کہ اگر تم مجھے آسانی سے بھلا بیٹھے
میں بھی تمہیں بھلا سکتی ہوں ۔

میں کبھی اختر کو ملنے نہ جاؤں گی

وہ جو میرا رشتہ لے کر آیا کرتی تھیں۔ ان کو پھوپھی نے جل کر نہ جانے کیا کیا
کچھ کہہ دیا ہے کہ انھوں نے کہلا بھیجا ہے ہم نے کہیں اور منگنی کر لی ہے۔

اس خبر نے جہاں دادا جان کو دکھ پہنچایا ہے۔ وہاں مجھے بے اندازہ خوشی بخشی ہے
پھوپھی اب اپنے لڑکے کو پیش کرنا چاہتی ہے۔

مگر میں بھلا کبھی اس سے شادی کر سکتی ہوں! کبھی نہیں کروں گی۔ میری زندگی تو پہلے
ہی تلخ ہو چکی ہے۔ اور اب مزید کیا تلخ ہو گی۔

چار مہینے گزر گئے ہیں۔ میں نے گھر پر ایف اے کی کتابیں منگا کر پڑھائی شروع
کر دی ہے۔ سعیدہ میری سہیلی کالج کے بعد روزانہ یہاں آ جاتی ہے۔ اور پھر ہم دونوں
مل کر کام کرتی ہیں۔

اختر کا خیال کسی لمحے نہیں بھولتا۔ میں اپنے آپ کو ہر لمحہ مصروف رکھنے کی کوشش
کرتی ہوں تاکہ اسے بھول جاؤں۔ ۔ ۔ ۔ سعیدہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ تم کتنی کمزور
ہو گئی ہو۔

اختر کو دیکھے چھ ماہ گزر گئے ہیں۔

پتہ نہیں وہ کس حال میں ہے!!

لیکن میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ خواہ مخواہ سوچ لیتی ہوں۔ جیسے شاید وہ بھی میرے
بغیر اداس ہو گا۔

لیکن اس نے بھلا کاہے کے لیے اداس ہونا ہے!

وہ اچھا بھلا ہو گا!

اے دل اب اسے بھول جا۔ ہمیشہ کے لیے بھول جا۔

پھوپھی اس گھر سے چلی گئی ہے۔ مگر چونکہ دادا جان نے اس کے لڑکے سے رشتہ
ن کیا۔ اس لیے جاتے ہوئے دادا جان کو کہہ گئی ہے۔ دیکھ لینا! تیری بیٹی کو سارے
ندان اور ساری برادری میں نشر کر کے چھوڑوں گی۔ اسے اس قابل نہیں رکھوں گی کہ کہیں
شادی ہو سکے۔ پھر تو خود ہی میری منتیں کرے گا۔ اور یوں تجھے اپنے قدموں پہ پڑا
ا دیکھوں گی۔

کتنی ذلیل عورت ہے۔ اسکا یہاں آنا بدنصیبی کے آنے سے کسی طرح کم نہیں
ا۔ جب سے یہاں آئی تھی ہزاروں طرح کی لڑائیاں کرواتی رہی تھی۔ اور اب جاتے
تے بھی دھمکی دے گئی ہے۔

یہ نیکی کا زمانہ ہے ہی نہیں۔ رہنے کو جگہ دے دی اور انعام یہ دے گئی ہے۔
اور اس نے تو ابھی نکلنا بھی نہیں تھا۔ دادا جان نے خود ہی اسے رخصت کیا
۔

اس کا لنڈورا بیٹا! انجم کو بری بری حرکتیں سکھا رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہمیں علم
نہیں تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کل جب انجم روتا ہوا میرے پاس آیا کہ وہ جو نیچے آدمی رہتا ہے نا ... میرے
ساتھ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مجھے اندر کوٹھڑی میں لے گیا تھا اور پھر۔ ۔ ۔ ۔ پھر اس
ک ایسی بُری بات بتائی کہ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ یہ بھلا کون ہوتا! میرے
کو خراب کرنے والا!

میں نے اسی وقت دادا جان اور والدہ کو بتایا۔ ۔ ۔ ۔ اور دادا جان نے دوسرے
ن پھوپھی کو نوٹس دے دیا کہ یہاں سے نکلنے کی تیاری کر دو۔
جہاں جی چاہے بیٹے کی شادی کر دو۔

اس بات پر بہت جھگڑا ہوا۔ اور نامراد عورت پھوپھی نے میرے وہ وہ طعنے
جان کو دیئے کہ ہمسائیاں توبہ توبہ کرنے لگیں۔

دادا جان سارے گھر میں گالیاں دیتے پھرتے تھے اور میں اور والدہ سہمی ہوئی تھیں۔

اس وقت میرا جی کس طرح رو رہا تھا! . . . . جس شخص کے لیے بدنام ہوئی جس شخص کے لیے زندگی کو روگ لگایا۔ وہ پھر بھی اپنا نہ ہُوا۔ اور یہی وہ نازک اور دردناک وقت ہوتا ہے۔ جب محبت پھوٹ کر روتی ہے۔

میں اس لمحے کس قدر ویران نہیں ہوگئی تھی . . . . میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

اگرچہ آدھی ہمسایوں نے یقین کیا تھا۔ اور آدھی ہمسایوں نے یقین نہیں کیا تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ میں کیسی لڑکی ہوں۔ کبھی کوٹھے پہ جاکر یا کھڑکی میں کھڑے ہو کر تانک جھانک نہیں کی تھی۔

مگر پھر بھی یہ عورت میرا زخمی دل تو دکھا گئی نا . . .

دادا جان کے دل میں تو برائی ڈال گئی نا . . . .

وہ پرانی وضع کے جاہل قسم کے آدمی ہیں۔ ایک پل میں گالیاں دینے پہ اُتر آتے ہیں۔

رات کو دادا جان آئے۔ تو میں ان کے سامنے ہی نہ ہوئی۔ ایک دو روز تک ان کا غصہ اتر جائے گا۔ میں ان کو سمجھالوں گی . . . .

دادا جان کو بات سمجھا دی جائے۔ تو سمجھ جاتے ہیں . . . .

لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ وہ نامراد تو یہاں سے چل دی نا . . . .

ایسی عورتوں سے خدا بچائے۔ یہ تو شیطان کو بھی آگے لگاتی ہیں۔

آج میرا دل بہت اداس تھا۔ نہ جانے اختر کیوں بار بار یاد آرہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ جب آنکھوں سے آنسو گرتے ہیں تو سارا جسم لرزنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ آنسو نہیں گرتے بلکہ خون نکلتا ہے

خون کے آنسو بہتے ہیں۔

آج جی چاہتا ہے کہ اختر سے ملوں۔ مگر کیسے ملوں؟ اور پھر فائدہ بھی کیا ہے؟ کیا معلوم۔ وہ مجھے بالکل ہی بھول چکا ہو!

یقیناً یہی ہوگا . . . . . وہ مجھے بھول چکا ہوگا! . . . . آہ!

ایک خط! جو پوسٹ نہ ہو سکا!:-

اختر! تم سے ملے بغیر یہ دن کچھ یوں گزر رہے ہیں۔ جیسے ان کا میری زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جیسے رنگین تصویروں کی کتاب دیکھتے دیکھتے اچانک بیچ میں سادہ اور سفید ورق آ گئے ہوں۔ جیسے سینما دیکھتے دیکھتے ایکا ایکی فلم ٹوٹ گئی ہو۔ آج نہ جانے کیوں تمہاری ایک ایک بات تمہارے ساتھ گزارے ہوئے وہ حسین دن مجھے بڑی طرح یاد آ رہے ہیں۔ جیسے میرے سامنے رنگین تصویروں والی فلم چل رہی ہو۔ جیسے میں گہرے اندھیروں میں روشنیوں کے خواب دیکھ رہی ہوں۔ جیسے ڈراؤنے خوابوں کی بجائے میں نے چمکیلے خوابوں کے ٹکڑے دیکھ لیئے ہوں۔

اختر! بے وفا اختر! میں اکثر سوچتی ہوں کہ وہ پھول اب کیوں نہیں کھلتے۔ جو ان دنوں کھلا کرتے تھے۔ اور ویسا ہی چمکیلا سورج اب کیوں طلوع نہیں ہوتا! جو پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں پر نہایت آب و تاب کے ساتھ چمکا کرتا تھا۔ لیکن اب تو شام کے گہرے سائے ہر طرف پھیل رہے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر وہ قوس و قزح ہمارے آسمان پر دوبارہ نہیں چھا سکتی۔ تو پھر ان دنوں کی سوگوار یاد کیوں باقی رہ جاتی ہے۔

شام کی اداسی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ اور میں تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ جو

ابھی پوسٹ نہ کر سکوں گی۔ اس لیے نہیں کہ یہ خط تم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے کہ اب ایسے خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا؟

تم مجھے بھول چکے ہو گے۔ نئے چمکیلے رنگ سے ثمینہ نے تمہیں اپنی طرف کھینچ لیا ہو گا۔ نئے پھول کی خوشبو تمہیں پسند ہو گی۔ تمہارے دماغ پر چھا چکی ہو گی۔ اور تم مجھے یکسر فراموش کر بیٹھے ہو گے۔

کاش! تم ایک غریب لڑکی کی محبت کو سمجھ سکتے!

میرا یہ انتظار بالکل فضول ہے۔ کہ شاید تم پلٹ آؤ۔ شاید تم واپس آ جاؤ۔ اور بہاریں اس اجڑے چمن کو ہرا کر دیں۔ اور ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے۔ زندگی کے طوفانوں سے اس پار اتر جائیں۔

کاش! بے وفا اختر! تمہیں اس کا احساس ہو سکتا۔ کہ تم نے وفاداری کو کس بے رحمی سے زہر پلایا ہے تم نے پھول کی پتی پتی نوچ کر فضاؤں میں بکھیر دی ہے۔ مگر تم اتنی دور جا چکے ہو کہ اب تمہیں پکارنا بالکل فضول ہے۔ محبت کا چشمہ تمہارے دل میں سوکھ چکا ہے ان درختوں پر اب کبھی پھول نہیں کھلیں گے۔

میری دنیا سے اب بہار رخصت ہو چکی ہے۔ درختوں نے افسردگی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔

محبت کا چاند پہاڑیوں کے عقب میں غروب ہو چکا ہے۔ اب چاندنی محبت کے گیت نہ گائے گی۔

تم! ایک بے وفا آدمی! یہ صرف تم ہی وہ شخص ہو۔ پہلے اور آخری۔ جس سے میں نے محبت کی ہے۔ اور اس محبت کو دل سے نکال دینا میرے بس سے باہر ہے۔ محبت کا پھول صرف ایک ہی بار کھلتا ہے۔ یہ سورج ایک ہی بار طلوع ہوتا ہے۔

اختر! تم نے اگر یوں چھوڑ دینا تھا۔ تو پھر میری معصوم جوانی کو محبت کے رنگ سے کیوں بھرا تھا۔ میری زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی۔ تم نے مجھے کیوں بلایا تھا۔ تم نے کیوں اپنا بنانے کا وعدہ کیا تھا۔

لیکن تم تو یہ ساری باتیں بھول چکے ہو گے ۔ تم مرد لوگ سارا کچھ آسانی سے فراموش کر دیتے ہو ۔

کاش ! میں بھی تمہیں بھلا سکتی !

اختر ! ایک لڑکی کی زندگی کو خراب کرنے سے پہلے تمہیں یہ سوچ لینا چاہیئے تھا ۔ جن وادیوں کو ۔ جن راہوں کو تم طے نہ کر سکتے تھے ۔ تم نے وہاں قدم ہی کیوں رکھا ۔

تم امیر لوگ ہو اختر ۔ اور ہم غریب ! ...... تمہارے گھر والے یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے ۔ کہ تم ایک غریب لڑکی سے شادی کرو ......

اختر ! کاش ! میں تمہیں اپنا دل چیر کر دکھا سکتی ۔ کہ میرے دل کے رِستے ہوئے زخم پر تمہارا ہی نام کھدا ہوا ہے ۔ تمہارے ہی گھاؤ لگے ہوئے ہیں ۔ مگر تم اپنی ذرا سی بات کہہ کر میرے چاروں طرف ویرانیاں پھیلا کر چل دیئے ۔

اور میں یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں ۔ کہ مرد کی محبت ایک لمحہ میں بدل سکتی ہے ۔

مرد جو کچھ کہتا ہے کبھی اس پر عمل نہیں کرتا ۔ مرد کبھی وہ نہیں ہوتا جو اپنے آپ کو ثابت کرتا ہے ۔

کاش ! تمہیں معلوم ہو سکتا ۔ کہ کس شدت کے ساتھ تمہاری پرستش کی جاتی رہی ہے ۔

کاش ! تمہیں اس کا ذرہ سا بھی احساس ہوتا ....

تمہیں معلوم ہو سکتا ۔ کہ محبت کتنی زبردست چیز ہے ۔ محبت تو ایک ازلی و ابدی چیز ہے ۔ یہ ایک آگ ہے ۔ جو ایک بار روشن ہو جائے تو ریشے ریشے میں سرایت کر جاتی ہے ۔ جو بجھنا نہیں جانتی ۔ محبت دل کے چور دروازوں سے داخل ہو کر کبھی رخصت نہیں ہوا کرتی ۔

لیکن تمہاری محبت محبت نہیں تھی ۔ تمہاری محبت "ہوس" تھی ۔ تمہارا پیار آلۂ

کی طرح اُمڈا ۔ آناً فاناً میں چھا گیا ۔ اور طوفان کی طرح چپ چاپ اتر گیا ۔

اختر ! تم نے مجھے ساری زندگی خون کے آنسو بہانے کے لیے چھوڑ دیا ہے ۔

میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی ! ... کاش میں تمہیں بھول سکتی ۔

میں تمہیں یونہی بے فائدہ خط لکھ رہی ہوں ۔ جو تمہیں کبھی نہ بھیجوں گی ۔ میں ایسے ہی کئی خط لکھ کر پھاڑ چکی ہوں ۔

اب تمہیں خط لکھنے کا کیا فائدہ !

آج کا دن ایک عجیب اداسی میں گزرا ۔ پیلی پیلی دھوپ اور آسمان پر چھائے ہوئے گہرے غبار نے سارے ماحول کو غمگین بنا رکھا ہے ۔ سردیوں میں بھیگے سے دھندلے دن کو جب بادلوں کے مٹیالے ٹکڑوں نے سورج کو ڈھانپ رکھا ہو ۔ اور چاروں طرف غبار کا گہرا خول ہو تو نہ جانے ایسے سمے دل کیوں اداس ہو جاتا ہے ۔

روح کسی بوجھ کے نیچے دبی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔ ساری دنیا غمگین نظر آتی ہے جیسے کسی چیز میں بھی حسن ۔ دل کشی اور رعنائی نہیں رہی ۔ میرے لیے تو ویسے بھی دنیا میں نہ کوئی خوشی رہی ہے اور نہ حسن رہا ہے ۔

..... اب تو میں اختر کو بھی بھلا رہی ہوں ۔

آج میں دوپہر کو کھانا کھا کر اُدھر گئی - اور ابھی بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ امّی نے آوازا
دیں . . . . .
میں نے پوچھا - کیا ہے ؟ تو کہنے لگیں تمہاری سہیلی کی نوکرانی آئی ہے -
میں نے کہا - ادھر ہی بھیج دو -
اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی - کہ وہ آسیہ کے ہاں سے آئی تھی -
میرا دل دھڑکنا شروع ہو گیا - میرا حلق خشک ہو گیا - پھر اُس نے بتایا کہ چھوٹے
صاحب بہت بیمار ہیں - انہیں بیمار ہوئے بیس روز ہو گئے ہیں اور انہوں نے آپ
کو بلایا ہے -
اس خبر نے مجھے شعلے کی طرح مضطرب کر دیا ! میرا جی چاہتا تھا کہ اگر اختر بیمار ہے
تو اس کی تیمارداری کرنے کا حق صرف مجھی کو ہے - میرا جی چاہتا تھا بھاگ کر جاؤں
اور اختر سے لپٹ جاؤں .
وہ میری زخمی محبت جس کا گلا اس نے بے رحمی سے گھونٹ ڈالا تھا - آج پھر
ایکا ایکی بے چین ہو گئی - روشنی کے مینار کی مانند میرے تاریک سمندر میں ابھر آئی
مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا - جیسے اسی پرانی محبت نے جس کا میں نے اپنے طور پر خا

کرنا چاہا تھا - اس نے یہ خبر سنتے ہی میرے سارے جسم کو جھنجھوڑ ڈالا ہے
- میں بہت پریشان ہو گئی .
اختر نے کس بے رحمی سے مجھے یادوں کے خزاں نصیب جنگلوں میں تنہا چھوڑ دیا
ہوا تھا - جہاں اس کی ہر بات ایک مستقل قہقہہ اور مذاق بن کر چاروں طرف پھیلی ہوئی
تھی - میں اس جنگل میں تنہا اور ماری ماری پھرتی رہی ہوں - بنجر اور تپتے ہوئے ریتیلے صحراؤں
میں دھنسی ہوئی تھی - میں نے وہ دن کس طرح بسر کیے تھے ؟ میں نے وہ سال کس مشکل سے
گزارا تھا ؟
اختر تم نے مجھے کس بری طرح مصیبتوں کے اس وسیع صحرا میں تن تنہا چھوڑ دیا - کیا
تمہیں ذرا خیال نہ آیا تھا ؟ تم نے اپنے کیے ہوئے وعدوں کا ایک لمحہ کے لیے بھی خیال نہ کیا .
تم نے وعدوں کے سارے سفینے ڈبو دیئے - اور تم ثمینہ سے شادی کرنے کے
لیے تیار ہو گئے - تم ثمینہ کے خیال ہی سے وہ سارا کچھ بھول گئے - جب تم نے میرے ساتھ
ل کر آسمان کی لازوال وسعتوں میں خواب دیکھے تھے - اور ستاروں کی وادیوں میں پہنچ
کر محبت کے گیت گائے تھے - تمہاری محبت پانے کے بعد میں نے اپنی زندگی کے مرغزاروں
ان ان پھولوں کو سنہری دھوپ میں کھلتے اور مہکتے دیکھا تھا جو اس سے پہلے کبھی نہ کھلے
تھے - جو اس سے پیشتر کبھی نہ مہکے تھے .
ہم محبت کرتے تھے . . . . . اور تم نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا
جب ثمینہ کو تمہارے سامنے پیش کیا گیا تو تم نے مجھے چھوڑتے وقت پل بھی نہ لگایا - تم
مجھے ایک لمحہ میں ہی گہری کھڈ میں گرا دیا .
اس کی نوکرانی کھڑی تھی اور میں خیال ہی خیال میں کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی تھی -
پھر میں ایک دم خیالوں سے چونک پڑی اور اسے کہا - تم جا کر کہہ دو - میں نہ آسکوں
ا - میرے پاس وقت نہیں ہے اور وہ چلی گئی -
اس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک روتی رہی - میں کیوں اسے ملنے جاؤں ؟
اور اس کا اب کیا ساتھ !

وہ رنگ محل میں رہتا ہے۔ اور میں وہاں رہتی ہوں۔ جہاں خاک اڑتی ہے۔
زندگی میرے لیے ایک سنگین حقیقت بن کر رہ گئی ہے۔ اور اس کے لیے
محض ایک مذاق ہے . . . . . میرے ہر سمت اداسیوں کے کھنڈرات سلسلہ در سلسلہ
پھیلتے چلے گئے ہیں۔ اور اس کے گرد خوشیوں کے راگ ہیں۔

میں وہاں ہوں جہاں کوئی آواز نہیں۔ کوئی گیت نہیں۔ کوئی زندگی نہیں۔ وادیوں
کا سورج ڈوب چکا ہے۔ پرندے گنگ ہو گئے ہیں۔

اب میں جا کر کیا کروں گی! . . . . . لیکن نہیں . . . . . میں جاؤں گی۔ اختر بیمار ہے
میں اسے دیکھنے ضرور جاؤں گی . . . .

یا خدا آج کا دن جلدی سے گزار دے۔ تاکہ میں کل جا سکوں اس وقت سہ پہر کے
چار بج رہے ہیں۔ اب نہ جا سکوں گی۔ کل جاؤں گی۔

ساری رات نہیں سو سکی . . . . اختر کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی
ہوں۔

آج میں اسے دیکھنے ضرور جاؤں گی . . . . جو رات جاگ کر دکھ کی
گزاری جائے . . . . وہ کس قدر لمبی رات ہو جاتی ہے! سو سال کی رات
ہو جاتی ہے۔

یوں لگتا تھا۔ جیسے کبھی صبح نہ ہو گی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ صبح ہو گئی
ہے ؛

آج میں اختر سے ملنے گئی۔ ایک طویل مدت کے بعد ان کے ہاں گئی تھی۔
اختر کے کمرہ میں گئی۔ وہ کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ کمرہ میں اور کوئی نہ تھا۔
میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوئی۔ کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اب میں سوچ رہی تھی۔
ے اٹھاؤں کیسے؟

کیا کمبل کھینچوں! لیکن اگر کوئی اور ہوا تو؟

کیا اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دوں!

لیکن میں خاموش بیٹھ گئی۔ بالآخر میں اٹھی۔ اور سرہانے کی طرف جا کر جھک کر
یکھنے لگی کہ اختر ہی ہے یا کوئی اور ہے؟

اور جونہی میں جھکی۔ اختر نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ پکڑ لیا۔ اور میرا منہ اپنے
ہ کے پاس لے گیا . . . . . میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے زبردستی اس کے ہاتھ
ائے اور وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا . . . . . میں دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ اچھا بھلا
ا بالکل بیمار نہیں تھا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گیا تھا۔

اس کو تندرست اور صحت مند دیکھ کر میرا جی اداس ہو گیا . . . . . افسردہ ہو گیا
. . . اور میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی! کہ کاش! یہ بیمار ہوتا! پھر میں اس کی تیمارداری

کرسکتی۔ اسے ملنے کے لیے آسکتی۔

اور تب! پھر شاید! اسے میری محبت کا خیال آتا . . . .

اختر مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا . . . . میں سوکھ کر آدھی سے بھی زیادہ کم ہو
گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اختر کے پاس پہنچکر مجھے رونا آجاتا۔ اس نے صرف اتنی سی بات
کہی۔ کہ یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔

اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔

مجھے خیال آجاتا ہے کہ یہی تو وہ شخص بیٹھا ہے جس نے مجھے برباد کیا ہے۔ میری
اداسی۔ میری تباہی . . . . میری غمگینی۔ میری کمزوری ہر چیز کا باعث صرف یہی شخص
ہے۔ اسی شخص کی محبت ہے جس نے میری زندگی کو دکھ میں بدل دیا ہے . . . .

اور اب یہی شخص مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ تجھے کیا ہوا؟ . . . .

کیا یہ رونے والی بات نہیں ہے؟

اس کے بعد بڑی مشکل سے اختر نے چپ کرایا . . . . بہت پیار کرنے
بڑی باتیں کیں۔ کہنے لگا۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکتا۔

میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کروں گا۔

اور میں نے ابھی تک ثمینہ سے بھی شادی نہیں کی۔ میں وہاں شادی کرنا نہیں
چاہتا۔ میں تو صرف تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ تم جو میری محبت ہو . . . .

اس کے بعد پھر اختر ایک بار مجھے ورغلانے لگا۔ کہنے لگا۔

میں تمہاری محبت کو آزمانا چاہتا تھا . . . . یہ دیکھنا چاہتا تھا . . . . کہ تم آتی
یا نہیں . . . . اور اگرچہ تم نے کل انکار کر دیا تھا۔ مگر مجھے پتہ تھا۔ تم آؤ گی۔

میں خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔ میرے پاس ان باتوں کا کیا جواب
تھا!

اس نے کہا۔ وعدہ کرو۔ تم اپنی صحت کا خیال رکھو گی۔

اور یہ سنکر مجھے رونا آگیا . . . . اختر کو بھلا میرا درد کیسے آگیا!

ن کی بے دردی نے تو مجھے دکھ دیا ہے۔ اور اب یہی میرا درد کر رہا ہے!
یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے! . . . . نہ نہ اختر! تم میرا درد نہ کرو۔ تم صرف
کرو۔ یہی تمہیں اچھا لگتا ہے۔

اختر نے بتایا کہ وہ اپنی امّی کو منا رہا ہے کہ وہ یہاں شادی کرنا چاہتا ہے۔
اور اگلے ہفتے تک اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اس کی اس بات نے مجھے
ان کر دیا . . . . پھر اختر نے وعدہ لیا کہ میں اگلے ہفتے معلوم کرنے ضرور آؤں۔

یہ ہفتہ ایک عجیب قسم کے موڈ میں گزرا ہے۔ عجیب کشمکش و پیچ میں کبھی آس
ھ جاتی تھی۔ کبھی ناامیدی ہو جاتی تھی۔ کبھی یہ خیال آجاتا تھا کہ شاید وہ میری حالت
ھ کر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

لیکن اگر اس کے دل میں چاہ نہیں ہے۔ تو پھر میں یہ شادی نہیں کروں گی۔
میں تو شادی سے زیادہ یہ چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے اور صرف مجھ سے محبت کرے
ک شادی نہ بھی ہو۔

شاید وہ میری حالت پر رحم کھا رہا ہے؛

خدا نہ کرے۔ اگر ایسی بات ہوئی۔ تو میں کبھی شادی ہی نہیں کروں گی۔

میں اسکا رحم نہیں چاہتی۔ مجھے رحم سے نفرت ہے۔ اگر اس نے مجھ پر رحم کیا تو
سختی سے ڈانٹ دوں گی۔

میں کوئی فقیرنی ہوں۔ جو وہ مجھ پر رحم کر کے مجھے خیرات دے۔

پرسوں اختر کے ہاں جانا ہے ۔ پتہ نہیں ۔ وہ کیا بتائے گا ؟

خدا کرے ..... وہ مجھے بہت بڑی خوشخبری دے ۔

پھر میں اختر کے پاس ہمیشہ رات دن رہوں گی ۔ پھر جدائی کے یہ ہولناک دن جتنے میں نے گزارے ہیں ۔ ان سب کی تلافی ہو جائے گی !

پھر دنیا کتنی خوبصورت ہو جائے گی ؟ ..... پھر ہر چیز چمک اٹھے گی !

یا خدا ! .... کیا تو میری اتنی سی آرزو بھی پوری نہ کرے گا ؟

کل کی چاندنی رات کس قدر خوبصورت تھی ۔ ذرّے ذرّے سے حسن چشمے کی مانند پھوٹا پڑتا تھا ..... نیلی نیلی بے داغ چاندنی چاروں طرف بچھی جا رہی تھی .....

چاندنی کسی خوبصورت دوشیزہ کی طرح چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی ...... ہر چیز پر سحر انگیز کیفیت طاری تھی ۔

میں مسحور سی ہو کر اختر کے متعلق سوچ رہی تھی ؟ یہ کس قدر خوبصورت رات ہے ! جب شہروں کی گلیوں کے اندر یہ خوبصورت رات ہے ۔ تو پہاڑوں اور جنگلوں میں یہ رات کیا حسین نہ ہو جاتی ہو گی ! میں ان پہاڑوں اور جنگلوں میں کب جاؤں گی ! جہاں ایسی خوبصورت چاندنی ہو گی ! ایسی خوبصورت راتیں تو سو کر نہیں بسر کرنی چاہئیں ۔

میرا جی چاہتا ہے میں چاندنی راتوں کا سارا حسن اپنی جھولی میں سمیٹ لوں ۔ ہائے میں تو اس کی شیدائی ہوں ۔

ایسی راتوں میں بس یہی جی چاہتا ہے کہ چاندنی میں نہلائے ہوئے خوبصورت باغوں میں جا کر رقص کریں ۔ خوب اچھلیں ۔ کودیں اور گائیں ۔ شور مچائیں ۔ اور آنکھ مچولی کھیلیں ۔

مگر ایسا کہاں ہو سکتا ہے ۔

ان جگہوں پر رہ کر ایسا سوچنا اور ایسے رنگین خواب دیکھنا لوگوں کے نزدیک محض حماقت ہے ۔ مگر میرے دل سے ایسی باتیں الگ نہیں ہوتیں ۔ بے شک چاہے یہ حماقت ہی کیوں نہ ہو !

آج میں اختر کے ہاں گئی ۔ تو اختر گھر پر نہیں تھا ۔ کچھ دیر کے بعد آیا اور اس کے ساتھ لڑکی بھی تھی ۔ اختر نے تعارف کروایا ۔

یہ ہے مس ثمینہ ! میری پھوپھی کی لڑکی ۔

اور یہ ہے ۔ مس زاہدہ سلطانہ ۔ آسیہ کی سہیلی ۔

ثمینہ جھک کر سامنے صوفے میں جا دھنسی ..... اس نے فیروزی رنگ کی ھی باندھی ہوئی تھی ۔ بال کٹے ہوئے تھے ۔ ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لپ لگی ہوئی تھی ..... بالکل خون کے رنگ کی ۔ جیسے ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آئی ۔ جیسے اس نے میرا ہی خون پیا ہے ۔ میرے ارمانوں کا خون ۔

میں خاموش زرد اور اداس چہرہ لیے بیٹھی تھی .....

اور اختر کبھی میری طرف دیکھتا تھا ۔ اور کبھی ثمینہ کی طرف ....

ثمینہ شرما کر اسے دیکھ رہی تھی ۔ ادائیں دکھا رہی تھی ..... اور اختر اس پر ار ہو رہا تھا ....

کچھ دیر کے بعد میں نے اختر سے اجازت مانگی کہ اب مجھے جانا ہے ۔
ثمینہ نے کہا کہ کچھ دیر بیٹھو ۔ مگر میں کاہے کیلئے بیٹھتی ۔

میں اٹھ کر آ گئی ..... میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اگر اختر نے ثمینہ سے شادی کرنی تھی ۔ تو پھر اس نے مجھے آج بلایا کیوں ؟

مجھے یوں لگ رہا تھا ۔ جیسے اختر مجھے بے وقوف بنا رہا تھا ....

ثمینہ کو دکھا کر یہ کہنا چاہتا تھا ..... دیکھا ...... میں جس سے شادی کرنا ہتا ہوں ۔ وہ کیسی ہے ؟

ہاں ! اختر سچ کہتا ہے .... محبت یونہی نہیں کی جاتی ۔

ایسی محبت میں آنسو نہیں بہائے جاتے .... بلکہ آنکھوں میں کر آنکھوں کو خوبصورت بنایا جاتا ہے تا کہ دیکھنے والے کو اچھی طرح گھائل کیا جا سکے ۔

ایسی محبت کرنے کے لیے ریشمی ساڑھی اور کٹے ہوئے بالوں کی ضرورت ہے۔
نازداداکی ضرورت ہے ۔ . . . . دولت کی ضرورت ہے ۔آسودگی او[ر] ... کی ضرورت ہے ۔رشتہ داری کی ضرورت ہے . . . . لیکن یہاں بھلا کیا ہے!

ثمینہ وہاں رہتی ہے ۔جہاں پھول کھلتے ہیں . . . . جہاں سکے کھنکھتے ہیں جہاں ریشمی ساڑھیاں ہیں۔

مگر ہم وہاں رہتی ہیں ۔جہاں رک رک کر بہنے والے آنسو ہوتے ہیں ۔غریبی ہوتی ہے ۔اور باسی پھولوں کے ہار ہوتے ہیں۔

کل تک اختر مجھے کہتا تھا ۔کہ ہمارا جنم جنم کا ساتھ ہے ۔اور آج وہ ثمینہ سے کہہ رہا ہوگا ۔مجھ سے پہلے اور نہ جانے کس کس کو کہتا رہا ہوگا ۔اور نہ جانے کب تک کہتا رہے گا؟

کیا اختر اس قدر گھٹیا ہے!

میں نے جس اختر کو تاج محل کا سنگِ بنیاد سمجھا ۔وہ تو سڑک پر پڑا ہوا پتھر نکلا . . . اس کی محبت کا قطب مینار سنگین چٹانوں پر نہیں بلکہ ریت کی بوریوں پر تعمیر ہوا تھا ۔ان لوگوں کے لیے محبت تاش کے پتوں کی طرح ہے جسے ہر ایرے غیرے میں بانٹتے پھرتے ہیں۔

ساری رات میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سو سکی . . . میری ساری روشنیاں میری آخری آس ہر چیز گل ہوگئی تھی . . . . رنگوں کے دیپک بجھ گئے تھے ۔روشن چاند ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نامعلوم تاریکیوں میں جا چھپا۔

اور میں اپنے آپ کو اس قدر نڈھال محسوس کر رہی تھی جیسے ابھی گری کہ گری۔

بت بنی بیٹھی ہوں . . . پاگلوں کی طرح چاروں طرف دیکھتی ہوں ۔نہ جانے کیا ہوگا؟ یہ صدمہ کیسے بھولے گا!

رات سے پھر بہت تیز بخار ہوگیا ہے . . . . منہ سے ایک لفظ تک نہیں لا جاتا . . . . دادا جان کہہ رہے تھے . . . . میری بیٹی کو نہ جانے کس نظر کھا گئی ہے۔

میرے دادا! کیا تو مجھ سے پیار کرتا ہے! کیا تو واقعی مجھے بیٹی سمجھتا ہے؟ ن بیٹی کو زہر لا کر دے دے کہ یہ مصیبتوں سے چھوٹ جائے۔

بخار اترتا ہی نہیں ۔نہ زور کا چڑھتا ہے . . . . نہ رات کو نیند آتی ہے راسا پڑھ لوں . . . . تو دماغ تھک جاتا ہے۔

ای رات دن پریشان رہتی ہیں ۔کہ نہ جانے ان کی بیٹی کو کون سا گھن لگ لیا ہے۔

مگر امی کو کیا پتہ؟!

زندگی کتنی عجیب ہوگئی ہے؟

کل میں ڈاکٹر کے ہاں سے واپس آرہی تھی ۔تو راستے میں اختر کا نوکر مل گیا ۔اس نے با کہ اختر بابو کی شادی اگلے اتوار کو ہو رہی ہے؟

اس خبر نے مجھے پاگل سا بنا دیا . . . . بڑی مشکل سے ڈاکٹر کی دکان تک پہنچی اور نڈھال ہو کر بنچ پر بیٹھ گئی ۔جیسے طوفان سے ٹوٹی ہوئی شاخ درخت ہوتی ہے ۔وہاں ے شمار عورتیں آئی ہوئی تھیں مگر مجھے کسی کا کچھ علم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں ۔میرا رنگ لیموں رح زرد تھا اور میری آنکھ میں کوئی آنسو نہیں تھا ۔یوں لگتا تھا ۔جیسے میرا کلیجہ کوئی کھا رہا ہے وب رہا تھا ۔ہاتھ پاؤں سرد تھے اور جسم گرم تھا۔

بڑی مشکل سے گھر آئی ۔ڈاکٹر کی دوائی پی ۔اور بے سدھ ہو کر پڑ رہی۔

اے نیلے آسمانوں پر بسنے والے خدا! میری دنیا تباہ کر کے تیرے ہاتھ کیا آیا۔

کونسی خوشیاں مفت دے دی تھیں ۔جن کی قیمت لینی تھی؟

آج اختر نے شادی کا کارڈ بھیجا ہے۔ کہ اگر مجھے اس سے محبت ہے تو میں اس کی شادی میں ضرور آؤں۔

او ظالم اور بے وفا شخص! کیا تو چاہتا ہے کہ میں اپنے جنازے میں خود ہی شریک ہونے آؤں؟ .... کیا میں اپنے سامنے تیری شادی ہوتے دیکھ سکتی ہوں! تجھے یہ کارڈ بھیجتے ہوئے بھی کوئی خیال نہ آیا۔

تم میرا سہاگ مجھ سے چھین کر مجھے کفن پہنا رہے ہو! تم سارے لوگ پتھر ہو۔ تم بھی ایک پتھر ہو۔ مجھے ان پتھروں نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ بہت جلد یہ سارے پتھر پھٹ جائیں گے۔ ریت چاروں طرف پھیل جائے گی اور یہ آندھی نہ جانے مجھے کہاں اڑا لے جائے گی۔

میں ریت کے اس طوفان میں نہ جانے کہاں کھو جاؤں گی۔

میرے بہن بھائی اور والدہ نہ جانے مجھے کہاں ڈھونڈتی پھریں گی۔ میں ان کو کہاں ملوں گی؟

آہ! یہ ایسا غم نہیں جسے میں بھول سکوں گی۔ یہ اسی اختر کی شادی ہو رہی ہے جس نے مجھے اپنی زندگی۔ اپنی جان کہا تھا۔ جس نے کہا تھا۔ زاہدہ! تم میرے جسم کا خون اور میرے پھول کی خوشبو ہو۔ تمہارے بغیر میں کبھی زندہ نہیں رہ سکتا! آہ! میں کس قدر بھولی تھی اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔

مگر وہ تو لفظوں کا سوداگر تھا۔ لفظوں کے مینا بازار سجا کر مجھے راستے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے زندگی بھر کا سودا چند جھوٹے اور کھوٹے سکوں سے بھی کم تر اور گھٹیا لفظوں پر یقین کر کے کر لیا۔ وہ تو کہتا تھا کہ میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے ہر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر مول لے لوں گا۔

اور پھر وہ مجھے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیتا۔ اور کہتا کہ کوئی مجھے تم سے الگ نہیں کر سکتا.... میں گھبرا جاتی۔ میرا سیلانس رک جاتا تھا۔ مگر وہ مجھے نہیں

چھوڑتا تھا..... اس کے اس رویہ سے مجھے ڈر آتا تھا۔ کیونکہ اس طرح پیار کرتے ہوئے اس کی شکل بدل جاتی تھی۔ وہ کوئی ایسا خونی درندہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ابھی ایک پل میں مجھے کھا جائے گا.... اور میں سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اسے تکتی تھی....

اور جب میں اسے کہتی

اختر!..... یہ تمہیں کیا ہو جاتا ہے..... تمہارا جسم ہانپنے کیوں لگ جاتا ہے۔ تمہیں بخار کیوں ہو جاتا ہے۔

تو وہ کہتا تم نہیں جانتیں۔ میں تم سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں اور جی چاہتا ہے تمہیں اپنے اندر اتار لوں۔ یا خود تمہارے اندر چلا جاؤں..... چند روز کے بعد جب تم میری بیوی بن جاؤ گی۔ تو پھر تم دیکھنا۔ جو میں نے ایک پل کے لیے بھی تمہیں چھوڑا۔ اس لیے کہ میں تم سے لازوال محبت کرتا ہوں۔ اور تم میری بیوی بننے والی ہو۔ میں تمہارا مالک اور شوہر ہوں۔

مگر اب وہ نگینہ سے شادی کر رہا ہے..... کیا مرد کی محبت یہی ہوتی ہے۔

اس نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی سے کھیلا اور جب دل بھر گیا تو لاپرواہی اختیار کر لی۔

مرد کی محبت جب لڑکی کو چھو لے تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔

اختر مجھ سے کبھی بھی محبت نہ کرتا تھا بلکہ وہ تو ایک عورت ایک جسم کو چاہتا تھا اب اسے ایک اور جسم مل گیا ہے۔ ایک خوبصورت جسم۔ ریشمی ساڑھیوں میں لپٹا ہوا وہ اسے بیوی کے روپ میں ملے گا..... وہ مجھ سے لاپرواہ ہو گیا ہے۔

بس اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہے۔ اختر نے مجھے جس قدر خوفناک دھوکہ دیا ہے جس بلندی سے گرایا ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہ کروں گی۔ خدا اس سے ضرور بدلہ لے گا..... اس نے ایک ایسا دل توڑا ہے جو ہمیشہ سے دکھی تھا۔ دکھی دل محبت کا بھوکا ہوتا ہے۔ اور... میری محبت عظیم محبت تھی... مگر اختر نے اسے پاؤں تلے کچل ڈالا:۔

کل امّی پانی کا اتنا بڑا گھڑا اٹھا کر اوپر لا رہی تھیں کہ سیڑھیوں پر پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ سیدھی نیچے جا گریں۔

گرنے کا دھماکہ ہوا۔ اور میری تو جان ہی نکل گئی۔ میں بستر کو چھوڑ کر بھاگی۔ دادا جان بھی گھر پر نہیں تھے۔ ساتھ کی ہمسائی کو بلایا اور امّی کو اٹھا کر اندر لائے۔ ان کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اور آنکھیں بند تھیں۔ نسیمہ نے رونا شروع کر دیا۔ انجم گھر پر نہیں تھا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑکا۔ کہیں میری امّی کو تو نہیں کچھ ہو گیا۔

بڑی دیر کے بعد امّی کو ہوش آئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

ایک پل میں ہی میری آنکھوں کے سامنے سے کئی تصویریں گزریں۔
مگر میں نے ایسے منحوس خیالوں کو اپنے پاس تک نہ پھٹکنے دیا۔
اور رات گئے تک امّی کو سینک کرتی رہی۔ گرم دودھ پلایا۔ رات کو دادا جان آئے تو ڈاکٹر سے دوائی لائے۔

اپنی بیماری مجھے بھول گئی ہے۔ اور امّی کی تیمارداری میں مصروف ہو گئی ہوں
امّی بہت بیمار ہو گئی ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کیا ہونے والا ہے؟ .....
یا خدا! ہم پر رحم کرنا ......
اچھے خدا! ہم پر اپنا کرم کرنا ...... ہم سے ہماری امّی کو نہ لینا میری جان لے لے مگر امّی کو آرام دے دے۔
راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں مانگتی ہوں۔
یا خدا! ہمارا قصور معاف کر دے۔

امّی سے کروٹ تک نہیں بدلی جاتی ..... بہت زیادہ کمزور ہو گئی ہیں۔ ان کو بیمار ہوئے ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ مگر آرام نہیں آتا۔ مجھے بھی بخار آتا ہے۔ مگر میری امّی کو آرام آ جائے .....

نہ گھر میں کھانا پکتا ہے۔ نہ کوئی ہنستا ہے۔ بازار سے دونوں وقت کچھ نہ کچھ آ جاتا ہے۔ میرا تو کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ صرف نسیمہ، انجم اور دادا جان کے لیے منگا لیتے ہیں۔

یا خدا! تو امیر لوگوں سے ڈرتا ہے۔ ان کو کچھ نہیں کہتا ...... مگر تو نے ہم پر کیوں اتنی سختی شروع کر رکھی ہے ...... پہلے تو نے ابّا جان کو چھین لیا اور اب امّی کو آرام نہیں دیتا۔

یا خدا! میری جان لے لے۔ یا خدا! آج ہی لے لے مگر میری ماں کو آرام دے دے
میرے خدا میری امّی کو لے کر ہم پر اور زیادہ سختی نہ کرنا .....!
ہمارے پاس اتنا روپیہ بھی نہیں ہے کہ شاندار طریقے پر امّی کا علاج کرائیں۔
ڈاکٹر بھی دس روپے فیس لیے بغیر نہیں آتا ..... اتنے اتنے قیمتی انجکشن وغیرہ کہاں سے منگائیں؟!

مگر امّی کو ضرور بچانا ہے۔
کیا میں اختر کو بتاؤں؟
لیکن نہیں ..... یا خدا! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے خواہ مخواہ اس کا نام لے لیا۔ وہ ہمارا کچھ نہیں لگتا۔ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلالوں گی مگر اسے کبھی نہ کہوں گی۔ کہ ں بیمار ہے۔
نجمہ کو خط لکھوں! مگر ایک عرصہ سے اس کا بھی خط نہیں آیا
...... نجمہ کو کیسے لکھوں! ......
کاش! وہ یہاں ہوتی!
میں اپنی ایف اے کی کتابیں بیچ ڈالوں گی مگر اس سے کیا ہوگا؟
یا خدا تو میری ماں کو آرام دے دے۔ ورنہ ہم سب کو مار ڈال اکٹھے ہی ہم سب اس دنیا سے اٹھا لے۔ اپنی اس دنیا سے جہاں ہم دکھ اٹھانے کو زندگی گزار رہے ہیں۔

آج امّی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ساری رات چارپائی کے ساتھ
لگی امّی سے نظر بچاکر روتی رہی ہوں . . . . . پاگل ہوگئی ہوئی لگتی ہوں..
. . . . امّی کے بعد ہمارا کیا بنے گا ؟

میری امّی جان ! میری پیاری امّی جان . . . . . اپنی آنکھیں کھول دے
دیکھ میری امّی ۔ تیری زاہدہ بیٹی تجھے بلا رہی ہے !
تو نے تو ابھی اس کی شادی کرنی ہے . . . . . ابھی تو انجم اور نسیمہ نے بڑا
ہونا ہے ۔

میرے خدا میری فریاد سن ۔ میری دعا قبول کر ::

امّی کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی ہے ۔ دادا جان خاموشی سے آتے
ہیں اور چپ چاپ بیٹھ جاتے ہیں ۔ اب نہ وہ گالیاں دیتے ہیں ۔ نہ کسی سے لوتے
ہیں ۔ پہلے سے زیادہ بوڑھے ہوگئے ہیں . . . . .

دادا جان کے ایک ایک کرکے پانچ جوان بیٹے مرگئے ۔ پھر تین بیٹیاں مرگئیں
اور اب . . . . ان کی بہو . . . . . بستر علالت پر دراز ہے ۔

یا ربّ العزّت ! اے پاک پروردگار ! اے میرے معبود ۔ آسمانوں پر لینے والے
خدا . . . . میری ماں کو آرام دے دے ۔ ہماری مصیبتوں میں ہزار بار اضافہ کردے
مگر ماں کو آرام دے دے ۔ کیا تو نہیں جانتا کہ ماں کے بغیر ہم کیسے زندگی بسر کریں گے
اور اگر تجھے نہیں پتہ . . . . . تو پھر ہم کو بہتر کر دے ۔ ہم سب کو اپنے
پاس بلالے ۔ ہم نے تیری دنیا میں رہ کر کیا کرنا ہے ؟

یا خدا ! ہم تیرے کھلونے ہیں ۔ تو ہم سب کو ستاتا رہتا ہے جو تیرا جی چاہتا ہے تو
کرتا ہے تو امیروں سے ڈرتا ہے ۔ ان کو کچھ نہیں کہتا . . . . .
مارے ہم کو . . . . . جو جی چاہے کرلے
تو نہ جانے کب سنے گا ؟ . . . . .

امّی کو وفات پائے ایک سال گزر گیا ہے ۔ اور مجھے سینی ٹوریم میں آئے چھ ماہ ہو
گئے ہیں . . . . . مگر پہلے سے زیادہ ہی بیمار ہوگئی ہوں ۔

پہلے تو صرف ایک پھیپھڑا چھلنی ہوا تھا . . . . . اب دوسرا بھی ہو رہا ہے . . . .
ڈاکٹر تسلیاں دیتے ہیں ۔ مگر میں ان کی جھوٹی تسلّی سن کر ہنس دیتی ہوں . . . . .
میں جانتی ہوں کہ میں کتنے روز کی مہمان ہوں ۔

اور اب جب کہ میں دن بدن مرنے کے قریب ہوتی جارہی ہوں نہ مجھے کوئی دکھ
رہا ہے ۔ نہ غم رہا ہے ۔ مجھے خوشی ہے کہ میں بہت جلد امّی اور ابّا کے پاس جانے والی
ہوں . . . . . دادا جان پہلے ہی پہنچ چکے ہیں . . . . . صرف ایک غم ہے . . . . . میری
نسیمہ بہن اور انجم بھیّا کا کیا بنے گا ؟

وہ فیصل آباد (لائل پور) میں خالہ کے پاس رہتے ہیں ۔ وہ یہاں نہیں رہ سکتے ۔
ان تین چار سالوں میں ہم پر کیا کچھ نہیں بیتا ؟ مگر گلہ کیسا ؟
اب کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے ۔ کسی سے نہیں ہے ۔ نہ خدا سے نہ دنیا والوں سے ۔
اختر بھی نہ جانے کہاں ہوگا ؟

آہ ! میں نے اس پھول سے پیار کیا ۔ جس کی خوشبو میں کبھی نہ سونگھ سکی ۔ اور ان
راستوں پر بیٹھی ۔ جہاں سے اختر کبھی نہ گزرا ۔

شام کی اداسی چاروں طرف چھا رہی ہے ۔ سینی ٹوریم کی اس اداس شام کا اندازہ
کوئی نہیں لگا سکتا . . . . . اور پھر آج کل تو خزاں کا موسم ہے ۔ جس کی وجہ سے فضا اور
بھی اداس اور تاریک نظر آتی ہے درخت پتّوں سے خالی ہوتے جارہے ہیں . . . . .
سامنے کے درخت سے زرد زرد پتّے ایک ایک کرکے گرتے رہتے ہیں ۔
. . . . . جیسے یہ میری یادیں ہیں ۔ جو ایک ایک کرکے میری زندگی کے درخت سے
بھڑتی رہتی ہیں . . . . . اور جب یہ درخت بالکل خالی ہو جائے گا ۔ تو میں مر جاؤں گی
ں دنیا کی باتیں ۔ یادیں سارا گھر یہیں چھوڑ جاؤں گی ۔

دور سیاہ پہاڑیوں کے پیچھے زرد آفتاب غروب ہو رہا ہے ابھی کچھ دیر کے بعد

چاند کالی کالی ٹہنیوں کے پیچھے سے نکل آئے گا۔ اور میری ختم ہوتی ہوئی زندگی کا ایک اور روز کم ہو جائے گا۔ ایک دن اور بیت جائے گا.... موت کی گھڑی اور قریب آ جائے گی اب مجھے موت سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ موت میری سہیلی ہے۔

موت ہی مجھے اپنے گھر میں پہنچا دے گی۔ ایسے گھر میں جہاں میرے ابّا اور میری امّی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں اپنی امّی اور ابّا کے پاس اپنے گھر میں رہنا چاہتی ہوں یہاں اس دنیا میں بالکل اکیلی ہوں.... پھر میں یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔

جوں جوں موت کے قریب ہوتی جاتی ہوں۔ اختر سے ملنے کی خواہش بڑھتی جا رہی ہے مگر میں اسے نہیں ملوں گی مجھے کیا خبر کہ وہ کہاں ہے؟

وہ زندہ ہوگا.... اور زندگی کی ہر خوشی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا ہوگا..... دنیا میں ایسے ہی لوگوں کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ خدا نے انہی لوگوں کے لیے زندگی بنائی ہے۔

ورنہ وہ ہمارا گھر یوں نہ اجاڑتا....

پہلے ہمارے ابّا کو لے لیا پھر غریبی دے دی۔ پھر امّی کو لے لیا۔ پھر دادا جان کو اور اب میری باری ہے۔ کچھ روز کے بعد نسیمہ اور انجم کی بھی باری آ جائے گی۔ ان دونوں کو بھی بخار رہتا ہے۔ کاش! یہ دونوں میرے سامنے مر جاتے۔

دونوں خالہ کے پاس رہتے ہیں۔ جو رات دن ان سے کام لیتی ہوگی..... اور کھانے کو کیا دیتی ہوگی.... میں تو چاہتی ہوں کہ خالہ زیادہ سے زیادہ ظلم کرے۔ تاکہ یہ جلد سے جلد ہم سے آن ملیں۔ میں ان کو دنیا میں عزیزوں کے گھر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی میں ان کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ جن بچوں کے والدین دنیا میں نہ رہیں۔ دنیا انہیں اپنے پاؤں تلے کچل ڈالتی ہے۔ اپنے ظلم کا نشانہ بنا ڈالتی ہے.... یہ دنیا میں ظلم سہنے کیلئے کیوں زندہ رہیں؟

میری معصوم کلیو! میرے بہن بھائیو! میرے قریب آ جاؤ.... ان دنوں میں تو میرے پاس رہو۔

روزانہ ڈائری لکھتی ہوں..... ڈاکٹر سے چھپ چھپ کر....

آدھی سے زیادہ ڈائری کھو گئی ہے.....

کاش! میں تندرست ہو جاتی.... تو اپنی داستان خود لکھتی۔ مگر.... اب نہیں لکھ سکتی.... جو لکھا تھا۔ وہ بھی آدھے سے زیادہ کھو چکا ہے۔ میرے مرنے کے بعد سب لوگ اس کو پڑھیں گے۔ شاید کسی کو اختر کا پتہ چل جائے.... اور وہ بھی جان لے پہچان لے۔

لیکن اگر اسے پتہ بھی چل گیا۔ تو کیا ہوگا؟ اسے تو جیتے جی میری پرواہ نہ ہوئی تو اب کیا ہوگی؟

آہ!.......!!

سینی ٹوریم میں بستر پر لیٹے لیٹے جب کھانستے کھانستے نڈھال ہو جاتی ہوں۔
تو اٹھ کر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہوں ۔ دور دور تک بستروں پر مریض پڑے ہوئے ہیں۔
کبھی کبھی سوچنے لگ جاتی ہوں ۔۔۔ کہ نجانے ان میں سے کتنوں کو دق کس
وجہ سے لگی ہوگی !! ۔۔۔۔۔

پھر جی چاہتا ہے۔ ان سب سے ان کے حالات پوچھوں اور ان سب کو
لکھوں اور پھر دنیا والوں کے سامنے پیش کروں کہ دیکھو! ۔۔۔۔ تمہارے ظلم کے
نشانے کہاں کہاں تک پہنچتے ہیں۔

کیا پتہ ان میں سے کئی لڑکیوں کو محبت کی وجہ سے دق ہوئی ہو۔

کیا خدا ان سے خون کا بدلہ لے گا! ۔۔۔۔ یوں کوئی کسی کو قتل کر دے تو فوراً پھانسی
کی سزا دی جاتی ہے مگر اس طرح ہزاروں لوگوں نے ہزاروں لڑکیوں کو ۔۔۔۔ لڑکوں
کو ظلم کر کر کے اندر ہی اندر گھٹن لگا کر موت کے گھاٹ پہنچایا ہوا ہے ۔ ان کا بدلہ کیوں
نہیں لیا جاتا! ظلم کرنے والوں کو سزا کیوں نہیں دی جاتی! یہ کیسا اندھا انصاف ہے!! ۔۔۔
اور خدا سارا کچھ دیکھتا ہے ۔ اور چپ رہتا ہے ۔ خاموش رہتا ہے ؎

ڈاکٹر اشفاق روزانہ آتا ہے ۔ کس قدر ہنس مکھ اور مہربان ڈاکٹر ہے ۔۔۔۔۔
مجھے کتنی تسلی دیتا ہے ۔۔۔۔۔ مجھ سے کتنی کتنی دیر تک باتیں کرتا رہتا ہے میرا
جی بہلاتا ہے ۔ وہ مجھے ٹھیک کرنے کی ہر ہر کوشش میں مصروف ہے ۔

لیکن میں کیسے ٹھیک ہو سکتی ہوں ؟ ۔۔۔۔ میں اسے کیا بتاؤں ۔۔۔۔ کہ اختر کا غم
مجھے کھا گیا ہے ۔ ایک مرد نے غم دیا ہے اور دوسرا مرد غم کو مندمل کر رہا ہے ۔۔۔۔
دیکھیں کون کامیاب ہوتا ہے ۔ اختر کا غم بھاری رہتا ہے ۔ یا ڈاکٹر اپنی کوششوں میں
کامیاب رہتا ہے ۔

ڈاکٹر مجھ سے کہتا ہے کہ اپنے دل کی ہر بات مجھے بتا دو ۔ مگر کیسے بتاؤں ؟ ۔۔۔
میں کبھی نہ بتاؤں گی ۔ اب یہ راز میرے منہ سے نہیں نکل سکتا ۔ ہاں ۔ اگر وہ میری یہ
ڈائری پڑھ لے تو پڑھ لے ۔

لیکن یہ بے ربط ڈائری ۔۔۔۔ کسی کو بھلا اس کی کیا سمجھ آئے گی ؛
اور پھر اگر کسی کو سمجھ آ بھی گئی تو کوئی محسوس کرنے والا ہی محسوس کرے گا ۔۔۔۔ عام لوگ
بھلا کیا سمجھیں گے ۔

کل یہاں ایک لڑکا آیا ۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ آیا تھا ۔ اس کی بہن کی سہیلی
یہاں بیمار ہے ۔ اسے دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑکا ۔ اس کی شکل بالکل
اختر سے ملتی ہے ۔

اور میں اس کے جانے کے بعد رات گئے تک روتی رہی ۔ بغیر آنسوؤں
کے روتی رہی ۔ اب میں آنسوؤں سے تو کبھی نہیں رو سکتی ۔ اب بغیر
آنسوؤں کے روتی ہوں ۔

شاید وہ کل پھر آئے ۔ وہ ضرور آئے ۔ میں اسے ضرور دیکھنا چاہتی ہوں

آج اس کی بہن آئی ہے ۔ مگر وہ نہیں آیا ۔ کیا میں اس کی بہن سے پوچھوں ؟ لیکن نہیں ۔ میں کسی سے نہیں پوچھتی ۔ میں کسی سے نہیں پوچھوں گی ۔

جب زندگی ختم ہو رہی ہو ۔ اور موت کا سفر شروع ہونے والا ہو ۔ تو ایسی باتوں سے کیا فائدہ ؟

یہاں کے اکثر بیمار مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم کو ملنے والا کوئی نہیں آتا ۔ اور میں ہنس دیتی ہوں ۔ میں ان کو کیا بتاؤں ؟ کہ مجھ سے ملنے کے لیے کس نے آنا ہے ؟ مجھ سے ملنے والے تو اس جہان میں پہنچ چکے ہیں ۔ جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا . . . . . اب ان سے ملنے کے لیے میں ان کے ہاں جاؤں گی ۔ اختر کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ یہاں آئے ۔

اے دنیا والو ! میں بہت جلد تم کو الوداع کہنے والی ہوں ۔ یہ بخار اور یہ کھانسی . . . یہ مجھے چند دنوں کے بعد ختم کر دیں گی . . . . پھر میں آسمانوں کی طرف چلی جاؤں گی..... نہ جانے دوسری دنیا کیسی ہو گی !

افسوس ! ڈاکٹر اشفاق نے جس طرح میری تیمار داری اور خدمت کی ہے میں نے اس کا حق بالکل نہیں دیا ۔ چند لمحوں کے لیے بھی دل سے غم کو دور نہیں کیا ۔ میں اس کا ساتھ کیونکر دے سکتی ہوں ؟ یہاں سے نکل کر میں اس بھری دنیا میں اور کہاں جا سکتی ہوں ! . . . . لوگوں کے لیئے بھری مگر میرے لیئے خالی دنیا ! پھر میں کیونکر اس سے تعاون کر سکتی تھی !

آج وہ لڑکی اور وہ لڑکا پھر آیا تھا . . . . میں کمبل کی اوٹ سے کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتی رہی ۔ بالکل اختر کی طرح لگ رہا تھا . . . . کہیں یہ اختر کا بھائی ہی تو نہیں ہے ؟ . . . . اختر کہا کرتا تھا....

کہ میرا ایک بھائی بالکل میری طرح ہے ۔ حتیٰ کہ اتنی شکل ملتی ہے کہ لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے ۔ مگر اس نے یہاں کیا کرنے آنا ہے ؟

آج کا دن کتنی خوشی کا دن تھا ! آج میں نے اپنی سہیلی نجمہ کو دیکھا ہے ۔ وہ مجھے دیکھ کر رونے لگ پڑی . . . . . اس کے پاس ابھی آنسوؤں کا ذخیرہ موجود ہے ۔ خدا کرے اس کی آنکھوں سے آنسو کبھی نہ بہیں ۔ میری آنکھ سے اب ایک بھی آنسو نہیں نکل سکتا ۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی ۔

کتنی مہربان ہے ! کتنا افسوس کرتی تھی کہ تمہاری یہ حالت کیسے ہو گئی ؟ اور میں نے اسے کہا ۔ نہیں پھر بتاؤں گی !

اور پھر کھانسی شروع ہو گئی ۔ اور کوئی بات نہ ہو سکی ۔ نجمہ روزانہ آتی ہے مجھ سے بات تک بھی نہیں ہو سکتی ۔ وہ طرح طرح کی باتیں کر کے میرا جی بہلاتی ہے ۔ ڈاکٹر سے باتیں کرتی رہی ۔ مگر . . . . میں بھلا کیسے ٹھیک ہو سکتی ہوں ؟

نجمہ نے بتایا کہ باجی کی شادی کے بعد اب اس کی شادی ہونے والی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں جلد ہی اچھی ہو جاؤں تاکہ اس کی شادی میں آسکوں ۔

نجمہ کتنی بھولی ہے ۔ بہت زیادہ !!

بھلا میں کبھی ٹھیک ہو سکتی ہوں !

آج اس کے جانے کے بعد میں تقریباً نیم بے ہوش سی پڑی رہی اور یہی سوچتی رہی . . . . کہ ہم لوگوں میں اور ان لوگوں میں کیا فرق ہے ؟

ہم نے کون سا گناہ کیا تھا ۔ جس کی سزا یہ مل رہی ہے ۔ کہ میں سینی ٹوریم

میں سسک سسک کر جان دے رہی ہوں۔ اور انہوں نے کون سی نیکی
کی تھی۔ کہ امن۔ خوشحالی اور خوبصورتی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ اور اب
اس کی شادی بھی ہو گی! یہ کس کا ہاتھ ہے۔ جس نے اسے خوشی بخشی ہوئی
ہے۔ اور ہمیں دکھ! ......
اس راز کو کہاں سے پاؤں! ......

آج! میری حالت زیادہ خراب ہے۔ آج یوں لگتا ہے۔ جیسے زندگی کی
آخری رات ہے......
کاش! میں اپنے بہن بھائیوں سے مل سکتی! پھر شاید میں مر نہ سکتی۔!
کتنا اچھا ہو۔ جو میں مرنے سے پہلے بے ہوش ہو جاؤں.... میں
یہ ڈائری وغیرہ نجمہ کے نام کر کے اسے بھجوا دوں گی۔
میرا دل ڈوب رہا ہے۔ اور آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں :-

زاہدہ کی ڈائری پڑھنے میں میں اس قدر محو ہوئی تھی کہ مجھے وقت کا پتہ ہی نہ
چلا..... اور جب میں نے ڈائری بند کر کے رکھی۔ تو میں پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگ پڑی۔
اور پھر چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔
سارے گھر والے اکٹھے ہو گئے تھے۔ پھر جب مجھے ہوش آیا۔ تو اختر میرے
پاس بیٹھا ہوا تھا.....
میں نے اسے دیکھ کر منہ نفرت سے دوسری طرف پھیر لیا۔ میرا جی چاہتا
تھا کہ میں اس شخص کو زندگی بھر نہ دیکھوں۔
یہ اختر میرا منگیتر جس کے ساتھ میری منگنی دو سال پہلے ہوئی تھی....
ثمینہ سے اختر کا بیاہ نہ ہو سکا تھا..... ثمینہ کی ماں نے شادی سے چار
روز پہلے وہ طوفان کھڑا کیا تھا۔ کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔
جب میں زاہدہ کی ڈائری پڑھنے کے بعد بے ہوش ہوئی تھی۔ تو وہ ڈائری
کھلی کی کھلی پڑی رہ گئی تھی..... اور میرے بے ہوش ہونے کے بعد سارے
گھر والوں نے اسے پڑھ لیا تھا..... اختر نے بھی پڑھ لیا تھا...

اور اب وہ مجرم بنا بیٹھا تھا۔ ۔ ۔ ۔

سب گھر والوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوئی کسی کو کیا کہے ؟

اور یہ اختر ہی تھا۔ ۔ ۔ جو سینی ٹوریم میں جاتا رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر افسوس کہ زاہدہ سے بات نہ کر سکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کاش ! زاہدہ ایک بار اس سے بات کر لیتی ۔